تجارت اور اسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

تمہید

امراض قومی اور ان کا علاج

دواؤک فیک ولا تبصر ودواؤک منک ولا تشعر
وتزعم انک جرم صغیر وفیک انطویٰ العالم الاکبر(۱)

نور وظلمت، سیاہی اور سفیدی، حرارت و برودت کی طرح صحت اور مرض دو متضاد حالتیں ہیں۔

ایک ذی روح کے جسم کا حد اعتدال میں ہونا، ہر قوت کا اپنے پیمانہ پر کام کرنا اور ہر پرزہ کا ٹھیک طور سے مصروف عمل ہونا صحت ہے اور اسی جسم کا اپنے مزاج فطری سے ہٹ جانا، کسی قوت کے کام میں نقصان پیدا ہوجانا، کسی پرزہ کا معطل ہوجانا یا کم از کم اپنے کام کو ٹھیک طور پر انجام نہ دینا مرض ہے۔

مرض کا علاج اگر شروع ہی شروع میں کرلیا جائے تو اکثر اس کا برطرف ہوجانا آسان ہوتا ہے، لیکن جب مرض دیرپا ہوجائے اور اس کی جڑیں طبیعت کے اندر جم جائیں تو پھر اس کا علاج دشوار ہوتا ہے یا کبھی غیر ممکن العلاج بن جاتا ہے، مگر امراض سب یکساں نہیں ہوتے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو خود اس کا بیّن طریقہ پر احساس ہوجاتا ہے جیسے اٹھا ہوا درد یا تپکتا ہوا پھوڑا، وہ فطری تکلیف اور وجدانی اذیت جو حاصل ہوتی ہے وہی انسان کو اس کا پتہ دے دیتی ہے۔ لیکن بہت سے امراض ایسے ہوتے ہیں جن کا نتیجہ اتنے محسوس طریقہ پر ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان فوراً اس کو سمجھ لے بلکہ اکثر ابتدائی منزل میں کہ جب اس کا علاج آسان ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا اور جس وقت خبر ہوتی ہے اُس وقت وہ قابل علاج ہونے کی حد سے گذر چکتا ہے اور علاج اس کا دشوار یا ناممکن بن چکا ہوتا ہے، جیسے دق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر پہلے درجہ میں اس کی اطلاع ہوجائے تو فوراً علاج آسان ہے اور اگر دوسرے درجہ میں خبر ہو تو علاج مشکل ہے اور تیسرے درجہ میں انتہائی مشکل۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مرض کا احساس اکثر اُسی وقت ہوا کرتا ہے کہ جب وہ دوسرے یا تیسرے درجہ کی حد تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اس وقت خبر بھی ہوئی تو کیا فائدہ؟ اس لئے کہ علاج کا وقت گذر چکا ہوتا ہے۔ اس کے لئے بے شک ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان ماہر ترین اطباء کی طرف رجوع کرکے اپنی جانچ کرائے اور اُن کے ہدایات پر عمل کرے اور اس کے لئے ضروری امر ہے کہ اگر طبیب اس کی بیماری کا احساس کرکے حکم لگادے کہ وہ بیمار ہے تو یہ اس کے قول کو اپنے ذاتی خیال پر مقدم سمجھ کر علاج میں مصروف ہوجائے۔ اُس وقت کامیابی کی توقع ہے۔ لیکن اگر طبیب کہتا رہا کہ تم بیمار ہو، مگر یہ اپنی ظاہری حالت پر بناء کرکے پورے طور سے اس عقیدہ پر قائم رہا کہ میں صحیح و سالم ہوں اور اِس لئے علاج کرنے کے بدلے وہ خود طبیب کا مذاق اڑاتا رہا تو ایسے شخص کے لئے کبھی صحت کی امید نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ مرض کے لئے اُس کی

(۱) ترجمہ: بیشک تمہاری دوا خود تمہیں میں موجود ہے لیکن تم آنکھ کھول کر دیکھتے نہیں اور مرض کا اصلی منشاء خود تمہارے ہی اندر ہے، لیکن تم کو احساس نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ ہماری ہستی ایک مختصر جسم میں محدود ہے حالانکہ تم میں حقائق و اسرار کا بہت بڑا عالم مضمر ہے۔

جہالت آغوش تربیت ہے اور نشوونما کے ساتھ حد کمال پر پہنچنے کے بعد اُس کا استیصال طاقت بشری سے باہر۔ نتیجہ کیا ہے؟ وہی ایک، یعنی ہلاکت۔

افسوس ہے کہ اِس وقت قوم کے امراض کی نوعیت یہی ہے۔ قوم بحالت موجودہ مریض ہے اور انتہائی مریض، لیکن اس کو اپنے مرض کا احساس نہیں رہا۔ اگر کوئی طبیعت شناس نباض بتلانا بھی چاہے کہ وہ بیمار ہے تو کیا فائدہ جبکہ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ فرض عائد یقینا ہوتا ہے کہ نبض شناس فرد قوم نے جب مرض کا احساس کرلیا تو وہ اپنے خیالات کا اظہار ضرور کردے، اس پر توجہ ہونا اور نہ ہونا دوسرا امر ہے۔

اکثر اوقات کسی خاص تغیر کا احساس اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اُس کی رفتار تدریجی حیثیت سے زمانہ کے امتداد کے ساتھ تھی اور انسانی طبیعت پر بھی برابر اسی رفتار زمانہ کی پابند۔

دھوپ پر آنکھ جمائے رہنے والا، کبھی اس کا احساس نہ کرے گا کہ وہ متحرک ہے بلکہ وہ دیکھنے میں اس کو ایک ہی جگہ پر قائم سمجھے گا۔ حالانکہ اس کی رفتار کا سلسلہ جاری ہے۔ بیشک اگر سوگیا، اُس وقت کہ جب دھوپ مغربی دیوار کے گوشہ سے متصل تھی اور بیدار ہوا اس وقت کہ جب وہ مشرقی دیوار تک پہنچ چکی تو اس وقت اسے احساس ہوگا کہ دھوپ نے کس قدر راستہ قطع کیا۔

بس اسی صورت سے قوم کا تنزل چونکہ تدریجی حیثیت سے ہے اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ، اور افراد قوم اسی زمانہ کی رفتار میں زندگی کی منزلیں قطع کرنے والے، لہٰذا انہیں بیّن طریقہ پر اپنے حالات کے انقلاب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی صورت یہی ہے کہ درمیانی کڑیاں نظر انداز ہوں۔ تاریخ نے سابقہ حالات کا فوٹو اپنے اندر الفاظ کی صورت میں محفوظ کرلیا ہے۔ اس کے اوراق کو الٹ کر آج سے پچاس، سو، دوسو برس اور اسی طرح آگے بڑھ بڑھ کر موجودہ پیش نظر حالت کے ساتھ اس کا تقابل کرتے جایئے تو معلوم ہو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے۔

ہم ایک وقت میں عظمت واقتدار کے مالک تھے، ہمارے نام کا سکّہ دنیا میں چل رہا تھا، ہمارے سامنے دنیا سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی، ہمارے اخلاق دنیا کے لئے سبق آموز تھے، ہمارے تعلیمات دنیا کے معلم تھے، ہمارے قدم سب سے آگے تھے اور ہم دنیا کے رہنما مقتدا و پیشوا تھے۔ لیکن اب کیا ہوا؟ اب یہ ہوا کہ ہم سب کے پیچھے ہیں اور دنیا ہم سے آگے۔ ہمارے عظمت واقتدار کا قلعہ نیست ونابود ہو چکا ہے، ہماری بنیادیں متزلزل ہیں، ہمارے شعائر پامال ہیں، ہمارے مقاصد پیوند خاک ہیں، ہم دنیا میں ذلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور دنیا کے ذلیل ترین اقوام ہم سے بلند سمجھے جاتے ہیں۔ آخر کیا ہوا؟ کدھر گئی ہماری عظمت اور کہاں گیا ہمارا اقتدار اور کیا ہوا ہمارا وقار؟ بیشک بتلا دیا ہے اسی خدا نے جو عزت کا اصلی مالک ہے: **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم** خدا تغیر وتبدل نہیں کرتا کسی قوم میں جب تک کہ وہ قوم اپنے نفسانی حالات میں تغیر پیدا نہ کردے۔

دوسری آیت: **ذلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔**

بات یہ ہے کہ ''خدا کسی اُس نعمت کو جو کسی قوم کو عطا کی ہے اس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تغیر پیدا نہ کردے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہمارے قومی حالات میں تغیر پیدا ہوا ہے تو اس کے اسباب کی تلاش ہم کو خود اپنے ہی اندر کرلینا چاہئے اور لسان قدرت کے بزرگ ترین ترجمان امیر المومنین علی ابن طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دونوں شعروں میں جو میرے اس بیان کا سرنامہ ہیں اسی کو ارشاد فرمایا ہے:-

> بیشک تمہاری دوا خود تمہیں میں موجود ہے لیکن تم آنکھ کھول کر دیکھتے نہیں اور مرض کا اصلی منشاء خود تمہارے ہی اندر ہے، لیکن تم کو احساس نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ ہماری ہستی ایک مختصر جسم میں محدود ہے حالانکہ تم میں حقائق واسرار کا بہت بڑا عالم مضمر ہے۔

بیشک مرض کی تشخیص سب سے پہلی اور بہت بڑی کامیابی ہے، پھر اس مرض کے اسباب کی تلاش دوسری منزل ہے اور اس کے بعد ان اسباب کے استیصال کی فکر اور مرض کے علاج کی کوشش آخری نتیجہ ہے۔

قوم کا پہلا مرض اور اس کا علاج

درآمد و برآمد کا عدم توازن

انسان کا دور زندگی تین حصوں میں منقسم ہے: سن نشوونما، سن وقوف اور سنِ انحطاط۔ اس لئے کہ قدرت نے اس کے نظام زندگی کو تجدد و تغیر پر مبنی قرار دیا ہے اور اُس کی بقاء کو غذائے خارجی کا پابند۔ اس کے جسمانی اجزاء زمانہ کی رفتار کے ساتھ تحلیل ہوتے رہتے ہیں، لیکن غذا کہ جو جسم میں پہنچتی ہے اس کا لب لباب اور جوہر لطیف انسان کا جزو بدن ہو کر تحلیل شدہ اجزاء کی قائم مقامی کرتا ہے اور اسی بدل ما یتحلل کی بدولت انسان کا نظام حیات قائم رہتا ہے۔ ابتدائی دور میں جتنے اجزاء جسم کے تحلیل ہوتے ہیں اس سے زیادہ مقدار غذا کی اس کا جزو بدن ہوتی ہے اس لئے اس کا جسم ترقی کرتا رہتا ہے اور روز بروز قوت وطاقت میں اس کی اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک کامل جوان کی حد تک پہنچتا ہے جو ترقی کی آخری منزل ہے۔ اب شروع ہوا سن وقوف، اس میں جتنی قوت انسان کے جسم سے تحلیل کی بدولت جاتی ہے اتنی ہی بدل کی صورت میں انسان کے جسم میں آجاتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اس کی حالت میں نہ زیادتی ہو اور نہ کمی، بلکہ وہ ایک حالت پر ٹھہرا رہے۔ اس کے بعد شروع ہوتا ہے تیسرا دور جس کا نام ہے سن انحطاط، یہ وہ ہے کہ جس میں انسان کے جسم سے تحلیل زیادہ ہو اور بدل کی صورت میں پیدا کم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان روز بروز کمزور ہوتا جائے اور اس کی قوتیں مضمحل ہوتی جائیں، اسی کا انجام ہے موت، جس کا دوسرا نام فنا۔

بس اسی اصول کے مطابق اگر آپ کو کسی قوم کے دورترقی، دورقوت، دورتنزل کا پتہ لگانا ہو تو یہ دیکھئے کہ اس قوم سے دوسروں کے پاس کتنا جاتا ہے اور دوسرے اقوام سے اس کے پاس کتنا آتا ہے۔

اگر آپ نے دیکھا کہ جتنا اس کے ہاتھوں سے دوسروں کے پاس جاتا ہے اس سے زیادہ دوسروں کے پاس سے اس کے پاس آجاتا ہے تو یقینا یہ قوم ترقی کر رہی ہے اور اس کی طاقت وقوت میں روز بروز افزونی ہی ہوگی۔ اور اگر ایسا ہے کہ بس جس قدر دوسروں کے پاس سے اس کے پاس آتا ہے اتنا ہی اس کے پاس سے دوسروں کے پاس چلا جاتا ہے تو پھر غنیمت ہے۔ سمجھئے کہ قوم ایک حالت پر قائم ہے۔ اس کے لئے اس صورت میں نہ ترقی ہوگی نہ تنزل، لیکن اگر کہیں ایسا ہوا کہ جتنا دوسروں کے پاس سے آتا ہے، اُس سے زیادہ اس کے پاس سے دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، تو سمجھئے کہ یہ ہے دورتنزل۔ اِس کا نتیجہ ہے کہ روز بروز ناتوانی وکمزوری میں اضافہ ہو، اور آخری انجام یہ ہے کہ وہ قوم صفحۂ ہستی سے فنا ہوجائے۔

اس معیار کے مطابق جب ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں تو افسوس کی انتہا نہیں رہتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ غیروں کے پاس جا رہا ہے اور غیروں کے پاس سے ایک حبہ بھی ہمارے پاس نہیں آسکتا۔ ہماری سابقہ دولتیں، موروثی اموال، برسوں کے نہفتہ ذخیرے ،جائدادیں، زمینیں، سب دوسروں کے پاس پہنچ گئیں۔ لیکن ہمارے ہاتھ میں کیا آیا؟ کچھ نہیں، اس صورت میں تو اگر خزانۂ قارون بھی ہوتا تو وہ ختم ہوجاتا اور آخر اس میں خاک اُڑنے لگتی۔ کنوئیں سے پانی کھینچتے رہئے، وہ پایاب رہے گا۔ مگر اس وقت جب تک کہ اس میں سوتے ہیں، یعنی جتنا کھینچتے ہیں اتنا آجاتا ہے لیکن اگر اُس کے حلقۂ اتصال کو مرکز آب سے قطع کردیجئے تو یقین سمجھئے کہ بہت جلد خشک ہوگا، اس لئے کہ اس میں برآمد کے ساتھ درآمد کا سلسلہ باقی نہیں رہا ہے۔

حیات انسان کی بنیاد دورانِ خون پر ہے۔ یہی رگوں میں دوڑتا ہوا خون وہ ہے جس پر نظام زندگی قائم ہے۔ بیشک اس

خون کو متحرک رہنا چاہئے، اور سیال، نظام زندگی قائم رہے گا لیکن اسی وقت کہ جب تک یہ خون عروق وشرائین کے راستوں سے ہر پھر کر جسم کے اندر رہتا ہے۔ لیکن اگر شہ رگ قطع ہوگئی یا ہاتھ کی متحرک نبض کٹ گئی اور یہ خون بہنا شروع ہوا تو یقین جانئے کہ اس کا نتیجہ ہے موت۔ بس اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایک قوم کی بقائے زندگی اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب تک اس کا سرمایہ ہر پھر کر اُسی قوم کے افراد کے پاس رہتا ہے لیکن اگر منفذ ہوگیا، سیّال کہ جس میں سے یہ سرمایہ نکل نکل کر باہر جانے لگا اور اس کی کوئی روک نہ ہوئی نہ اس کا کوئی بدل حاصل ہوا تو یقیناً اس قوم کا آخری نتیجہ ہے فنا۔ اب دیکھ لیجئے خود کہ آپ کی قوم کی بھی یہی حالت ہے یا نہیں؟

یہ کیوں؟ اس لئے کہ تمام وہ ذرائع واسباب ترک کردیئے جن سے حصول آمدنی کا امکان ہے، اور تمام وہ باتیں اختیار کرلیں جن سے دوسروں کو نفع پہنچنے کا موقع ہے۔ ضروریات زندگی کو اتنا وسیع کیا کہ ہر شے کی احتیاج زیادہ سے زیادہ ہم کو ہوگئی اور خود ان ضروریات کے پورا کرنے کا سامان نہ کیا تاکہ ہمارے ضروریات خود ہم ہی سے پورے ہوتے، نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی ضروریات پورے ہوئے مگر اس طرح کہ 'ہماری دولت اور غیر کا خزانہ'۔

پھر اس کا علاج؟ علاج یہی ہے کہ ایسے ذرائع کو دوبارہ اختیار کرو جن سے تمہارا روپیہ تمہاری ہی جیبوں میں رہے، یا اگر دوسروں کے پاس جائے تو دوسرے کے پاس سے بھی اسی تناسب سے تمہارے پاس آجائے۔

تجارت، صنعت وحرفت اور زراعت یہی چیزیں وہ ہیں جن سے قوموں کی زندگی ہوتی ہے اور ان ہی چیزوں کا ترک کرنا وہ تھا کہ جس نے ہماری قوم کو اس درجہ تنزل تک پہنچایا۔ اب اگر قوم زندہ ہونا چاہے تو ان ہی ذرائع کو پھر اختیار کرنا پڑے گا جو اُس کی زندگی کے باعث ہوں اور اس کو معراج ترقی تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوسکیں۔

مرض کا سبب اصلی
افراد قوم کی ذہنیت اور غلط خیالات کی پیداوار

انسان کا طرز عمل حقیقۃً اس کی ذہنیت کا پابند ہوتا ہے۔ انسان کے اندر عملی کمزوری اکثر ان خیالات کے تحت میں ہوتی ہیں جو اس کے دل ودماغ میں راسخ ہوگئے ہیں، اس لئے جب ہم اس مرض کے متعلق غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ کچھ خیالات کا نتیجہ ہے جو افراد ملت کے دماغ میں غلط طور پر قائم ہوگئے ہیں اور وہ اکثر افراد کے زبان وقلم پر بھی آجایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم مختصر طور سے ان خیالات کا جائزہ لے کر ان کی جانچ کریں گے کہ وہ کہاں تک حقیقت سے مطابق ہیں۔

پہلا خیال اور اُس کا دفعیہ

سب سے پہلا خیال یہ ہے کہ اسلام نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہے اور طلب دنیا سے منع کیا ہے، دین ودنیا کا اجتماع ممکن نہیں ہے اور اس لئے انسان کو دین کے ساتھ دنیا کا طالب ہونا خیال خام ہے۔ آئمہ معصومینؑ نے اپنے اقوال وافعال سے ہمیشہ دنیا طلبی کو ممنوع ثابت کیا ہے اور حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلاۃ والسلام نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دے دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے اپنے اسلامی احکام کے تحت میں مال دنیا کی تحصیل میں کدوکاوش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ خیال وہ ہے جو اکثر دماغوں میں موجود ہے اور اکثر پڑھے لکھے افراد تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں، جن میں قدیم وجدید تعلیم یافتہ دونوں ہی داخل ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اس کو مسلمہ طور پر احکام اسلام کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہوئے اپنے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ اس کو احکام اسلامی کے خلاف بطور اعتراض پیش کرتے ہوئے 'اسلام مانع ترقی' کی آواز بلند کرتے ہیں، لیکن اگر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس خیال پر نظر کی

جائے تو اس کی کمزوری طشت از بام ہوجائے گی اور معلوم ہوگا کہ وہ واقعیت سے کوسوں دور ہے۔

انسان کے اندر قدرت نے دو جز ودیعت کیے ہیں، ایک مادہ اور دوسرے روح۔ بے شک یہ دو جز اُس کی ہستی میں لازم وملزوم ہیں اور ہر ایک کے لئے ایک خاص حیثیت سے ترقی ہے اور اُس کے کچھ خصوصیات ہیں۔ انسانی افراد کے طرز عمل اور مختلف اقوام کی تعلیمات پر جب نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کی نگہداشت میں افراط وتفریط کی حدوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ بعض مادیت کے اندر اتنے مستغرق ہوئے کہ انہوں نے روح کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور انسان کی ہستی کو اسی جسمانی ترکیب وتالیف میں محدود سمجھ لیا اس لئے اس کا آخری نقطۂ مقصد جو کچھ قرار پایا وہ مادی خواہشات کا پورا کرنا اور جسمانی راحت وآرام کے اسباب مہیا کرنا اور بس۔ اکثر افراد ایسے بھی تھے کہ جو عقیدہ کے اعتبار سے روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے سوائے مادی خواہشات کے پورا کرنے کے ان کا کوئی نصب العین نہ رہا، ان کی عمر گذری اپنے طاقت واقتدار کے مظاہرہ، رعب وجلال کا سکہ قائم کرنے، مظلوموں کا گلا کاٹنے، حقوق غصب کرنے اور جس صورت سے ہو اپنے سرمایہ ذاتی اور مفاد شخصی کو تقویت پہنچانے میں اور بس۔ یہ مادہ پرستی یا مادہ پروری کا نقطۂ افراط ہے جس میں روحانیت بالکل معدوم نظر آتی ہے۔

دوسرا گروہ اپنے مذاق کے مطابق روحانیت کی طرف اِتنا متوجہ ہوا کہ اس نے مادی ضروریات کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا۔ بودھ مذہب اور عیسائی راہبوں کے تعلیمات میں اس عنصر کی کمی نہیں ہے۔ افراد بشر سے تعلقات قطع کرکے آباد شہروں کی سکونت کو چھوڑ کر ویرانہ بسانا اور پہاڑوں کی کھوہوں کے اندر عبادتِ پروردگار میں مصروف ہوجانا اور ماسویٰ اللہ سے بخیال خود کسی تعلق کا قائم نہ رکھنا اس تعلیم کے خاص جو ہر ہیں۔ یہ پہلے خیال کے تقابل سے نقطۂ تفریط ہے جس میں مادی ضروریات کو ناقابل اعتنا قرار دینے یا فنا کر دینے کی کوشش مضمر ہے اور خالص روحانیت کو ترقی دینے کا خیال مدنظر معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ کلیہ ہے کہ ہر جذبہ جب تک حد اعتدال میں ہے، حق بجانب ہوگا اور ادھر حد اعتدال سے خارج ہوا، اُس کے کمال میں نقص پیدا ہوا۔

مذہب اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں وہ تمام دیگر مذاہب سے ممتاز ہے یہی ہے کہ اس کے تعلیمات میں حد اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہمیشہ افراط وتفریط کے نقطوں کو بچا کر جادۂ وسط کی رہنمائی کی گئی ہے اور اسی بنا پر ارشاد کیا گیا تھا کہ "**جعلنا کم امة وسطا**" "ہم نے تم کو امت وسط یعنی جمیعت عادلہ قرار دیا ہے" بے شک نقطۂ وسط ہی وہ ہوتا ہے جہاں آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے واپس آنا اور پیچھے رہنے والوں کو بڑھ کر پہنچنا لازم ہے۔

اصل منزل سے پیچھے رہ جانے والا جس طرح منزل سے ابھی دور ہے اسی طرح منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانے والا، اگر اپنے سلسلۂ رفتار کو جاری رکھے تو منزل سے دور ہی ہوتا جائے گا۔ ایک خاص شہر کے ارادہ سے ریل پر بیٹھنے والا جس طرح اس کا دھیان رکھے کہ وہ اُس منزل سے پہلے کسی دوسرے اسٹیشن پر نہ اُتر پڑے، ویسے ہی اس کا خیال بھی رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوتا رہے اور اسٹیشن پیچھے ہی چھوٹ جائے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے اور وہ شخص منزل پر پہنچنے سے محروم۔

اسلام نے اس مادیت وروحانیت کے مسئلہ میں بھی حد اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ اُس نے جس طرح مادیت پرستی کو پامال کیا اور خالص مادیت کی بنیادوں کو ملیامیٹ کیا ہے اسی طرح اُس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ اُس مادی زندگی سے بالکل آنکھیں ہی بند کر لو اور اپنے جسمانی زندگی کے ضروریات کو بالکل تج ہی دو۔

اگر اسے اس مادی زندگی سے کنارہ کشی جائز قرار دینا ہوتی تو وہ خودکشی کو حرام قرار نہ دیتا، اس لئے کہ اس میں تو حقیقی معنی میں روح کو اس جسمانی قید سے آزاد کرنے کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے،

لیکن اس نے ''لاتلقوا بایدیکم الی التھلکه'' کہہ کر خودکشی کو ایک جرم قرار دے دیا اور حفاظت نفس کو انسان کا فریضۂ لازمہ بنایا۔ اس نے **لا رهبانية في الاسلام** کہہ کر اس نام نہاد روحانیت پرستی کا خاتمہ کر دیا جو اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں رائج تھی اور جو نظام اجتماعی وتمدنی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتی تھی۔

اُس نے دنیا وآخرت کے درمیان کوئی ایسی سد محکم قرار نہیں دی ہے کہ جس کا ٹوٹنا ممکن نہ ہو بلکہ اُس نے ان دونوں کو لازم وملزوم، دست وگریباں قرار دے کر چاہا ہے کہ وہ دونوں اس طرح سموجائیں کہ دنیا دنیا اور آخرت آخرت نہ رہے بلکہ دنیا بھی تمہید آخرت بن کر منزل آخرت قرار پاجائے۔ یہی معنی ہیں قول جناب رسالتمآبؐ کے ''**الدنيا مزرعة الآخرة**'' (دنیا آخرت کے لیے کھیتی کی مثال ہے۔) جس طرح انسان کھیتی کرکے اس کے ثمر کو حاصل کرتا ہے اسی طرح انسان دنیا کی آرائش اس طرح کرے کہ اُس کا نتیجہ خیر آخرت میں حاصل ہو۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ دنیا کو آخرت کے منافی سمجھ کر اس سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس پر قابو اور اپنے ضمیر پر اقتدار نہیں رکھتا، وہ دنیاوی اسباب زندگی کو اس طرح صرف کرنا نہیں جانتا کہ اُن سے آخرت کی منزل حاصل ہوسکے۔ اسلامی کتاب معجز اور فرمان محکم قرآن مجید کی تعلیم تو یہ ہے **ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة** ''خداوندا! ہم کو دنیا میں اپنی ایک نعمت عطا کر اور آخرت میں ایک'' اور پھر صریحی طور سے ارشاد کیا کہ ''**ولا تنس نصيبك من الدنيا**'' یعنی تمہارا دنیا میں حصہ موجود ہے کہ اس کو بھول نہ جانا، اور رہنمایان مذہب کی آوازیں ہیں کہ دنیا کو بالکل ترک کر دینا غلطی ہے۔ رسولؐ کے بعد دنیائے اسلام کے سب سے بڑے معلم روحانی امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔ اُس وقت جب کہ علا ابن زیاد نے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کی شکایت کی کہ اس نے لباس تصوف پہن کر دنیا سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ وہ شخص حضرت کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ آپ نے نہایت تہدید آمیز الفاظ سے فرمایا: **ياعدي نفسه لقد استهام بك الخبيث امارحمت اهلك وولدك أترى الله احل لك الطيبات وهو يكره أن تأخذها**۔ ''اے اپنے نفس کے دشمن! حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے تجھ کو بہکا دیا ہے، ارے تو نے اپنے اہل وعیال اور اولاد کا بھی خیال نہ کیا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ خدا نے طیبات کو حلال تو کر دیا ہے لیکن تیرا استعمال کرنا ان طیبات کو اسے ناگوار گذرے گا؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریحی طور پر فرمایا ''**ليس خيركم من ترك الدنيا لاخرة ولا آخرته لدنياه بل خيركم من أخذ من هذه وهذه**'' ''تم میں سے وہ شخص قابل تعریف نہیں ہے جو دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑ بیٹھے، اور نہ وہ جو آخرت کو دنیا کے لیے ترک کر دے، بلکہ اچھا وہ شخص ہے جو دنیا وآخرت دونوں میں حصہ لے''۔

اسلام نے بیشک ترک دنیا کی تعلیم دی ہے لیکن وہ دنیا جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے آخرت سے جداگانہ ہے جس کی مختصر شناخت یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی وشخصی مفاد کی خاطر آئینی وغیر آئینی ہر قسم کے طرز عمل پر تیار ہوجائے سرمایۂ شخصی میں اضافہ کر کے اپنے افراد قوم پر بیجا تفوق کا مظاہر کرے اور اپنے غرور ونخوت کے سر کو بلند کرے۔ بیشک یہ سرمایہ داری وہ ہے کہ جس کو اسلام نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہ اگرچہ اشتراکیت کا حامی نہیں ہے اور اس راستہ کی رہنمائی نہیں کرتا جس پر اس وقت روس قدم زن ہے لیکن پھر بھی اس نے ایک معنی سے اغنیا کے اموال میں فقراء کو شریک قرار دیا ہے یعنی فرض مذہبی کی حیثیت سے ان اغنیا پر ان کی اعانت ودستگیری کا حق عائد کر دیا ہے اور ایک مخصوص مقدار اُن پر واجب الادا قرار دی ہے، جس کا ادا کرنا ان کا فرض ہے اور اس طرح اُس کے ادا کرنے پر اُن کو فقراء کے اوپر کسی احسان جتانے اور منت رکھنے کا موقع بھی نہیں

دیا گیا، اس لئے کہ وہ تو ان کے حق کو ادا کر رہے ہیں۔ کچھ بلا استحقاق اپنی جیب سے اُن کو عطا نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح اسلام نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کی دولت اجتماعی حیثیت سے افراد قوم کی شیرازہ بندی میں صرف ہوا اور انفرادی ترقی واجتماعی ترقی کے ساتھ توام رہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف اغنیائے ملت نے اپنے فرض کو ادا نہ کیا، امانت خدا کو جو درحقیقت ان کے ہاتھوں میں ودیعت رکھی گئی تھی۔ اپنا ذاتی واستحقاقی مال سمجھ کر اس کو اپنے خزانوں میں محفوظ کیا، دوسری طرف قوم کی اکثریت نے ترک دنیا کے اسلامی احکام کو غلط انداز نگاہ سے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ کسب معیشت اور سرمایہ کی جمع آوری میں کسی قسم کی جدوجہد کرنا نفرت انگیز ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں مجموعی حیثیت سے نکبت وافلاس نے خیمے ڈال دیئے اور وہ دنیا کے تمام اقوام سے زیادہ بے مایہ وتہی دست نظر آنے لگے۔ حاشا کہ اسلام کسب معیشت اور ذاتی محنت سے مال حاصل کرنے کو بُری نظر سے دیکھے اُس نے تو کسب معاش کو مذہبی حیثیت سے اتنی اہمیت دی کہ ارشاد ہوا: "**طلب الحلال جهاد**" "مال حلال کو حاصل کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے" کبھی ارشاد ہوا "**افضل الاعمال الكسب الحلال**" "بہترین اعمال کسب حلال ہے"۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا: "**العبادة سبعون جزء ا أفضلها طلب الحلال**" "عبادت کے ستر (۷۰) جزو ہیں۔ جن میں سب سے افضل کسب حلال ہے"۔

کہاں ہیں عبادت کے مفہوم پر پابندی عائد کرنے والے اور اس کی وسعت کو تنگ بنا کر اس کو صرف نماز وروزہ حج و زیارت میں محدود بنانے والے، دیکھیں اس حدیث کو اور سمجھیں کہ اسلام شخصی عبادات کے ساتھ اجتماعی مفاد کی ترقی اور نظام زندگی کی شیرازہ بندی کو کس طرح عبادت کا ایک اہم جزو قرار دے کر اُس کا حکم دے رہا ہے۔

اور ملاحظہ ہو **كان رسولؐ الله جالسا مع اصحابه فنظروا الیٰ شاب ذی جلد وقوة وقد بكر يسعیٰ فقالوا ويح هذا لو كان شبابه وجلده فی سبيل الله** ایک روز رسالتمآبؐ حلقۂ اصحاب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اصحاب کی نظر ایک جوان توانا وتندرست اور طاقتور پر پڑی جو صبح سویرے طلب معاش میں گھر سے باہر نکلا تھا۔ اصحاب نے کہا کہ افسوس! اس کی جوانی وطاقت جسمانی خدا کی راہ میں صرف ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ یہ سننا تھا کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ **لا تقولوا هذا فانه ان كان يسعیٰ علیٰ نفسه ليكفها عن المسئلة ويغنيها عن الناس فهي في سبيل الله وان كان يسعیٰ علی ابوين ضعيفين او ذرية ضعاف فيغنيهم ويكفيهم فهو في سبيل الله وان كان يسعیٰ تكاثر واو تفاخرا فهو في سبيل الشيطان** "ایسا نہ کہو کہ اس لئے کہ اگر یہ اپنے نفس کے لئے جدوجہد کرتا ہو کہ اسے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے محفوظ اور لوگوں سے مستغنی کرے تو وہ حقیقۃً خدا ہی کی راہ میں مصروف ہے اور اگر وہ ضعیف العمر ماں باپ یا کمزور اولاد کے لئے 'سعی' کوشش کر رہا ہے تا کہ انہیں لوگوں سے مستغنی بنائے اور امداد پہنچائے تو بھی خدا کی راہ میں ہے۔ بیشک اگر ذاتی گھمنڈ اور نخوت وغرور کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہو تو وہ شیطان کے راستے پر ہے۔

اس حدیث سے مطلب بالکل صاف ہوگیا۔ اور معلوم ہوا کہ کس طرح نیت واقعیت اور اُس کے حکم کو بدل دیتی ہے۔ اب اسلام کے ترک دنیا کے احکام کو مطلق کسب معیشت اور طلب حلال پر منطبق کرنا صریحی غلطی نہیں تو کیا ہے۔

اس سب کے ساتھ جب رؤساء ملت اور رہنمایان اسلام کے طرز عمل اور سیرت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عملی حیثیت سے اس خیال کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسالتمآبؐ نے نبوت سے پہلے تاجرانہ زندگی اختیار کی اور ایک مرتبہ حضرت ابوطالبؑ کی معیت

میں اور دوسری مرتبہ اموال جناب خدیجہؑ کو لے کر تنہا شام کی جانب تجارت کے لئے تشریف لے گئے اور یہی تجارت وہ تھی جو تمہید بعثت قرار پائی، اسی سلسلہ میں حضرت خدیجہؑ کو آپ کی جانب میلان طبعی پیدا ہوا اور حضرت کی شادی خدیجۂ کبریٰ کے ساتھ ہوگئی جس کے بعد اسلام کی ترقی کے لیے مالی دشواریوں کا سوال برطرف ہوا اور حضرت کو تبلیغ اسلام کا حکم ہوا۔عقیدہ کی بناء پر رسولؐ کا فعل جس طرح بعد بعثت لازم الاتباع ہے اسی طرح قبل بعثت، اس لئے کہ عصمت جو اُن کے طرز عمل کو یقینی طور سے قابلِ تقلید بنانے کی ذمہ دار ہے۔ وہ اُن کی زندگی کے ہر دور میں موجود تھی۔

جناب رسالتمآبؐ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام جو آئین شریعت کے حقیقی نگہدار تھے انہوں نے برابر اس طرز عمل کو قائم رکھا۔ وہ کسب معیشت کے سلسلہ میں اپنی ذاتی محنت کے صرف اور کدوکاوش کو اپنے لئے عار و ننگ نہ سمجھتے تھے اور نہ اسے ترک دنیا کے خلاف تصور کرتے تھے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب جن کے متعلق بڑے زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت نے دنیا کو طلاق دے دیا تھا اور واقعہ بھی یہی ہے جس کے نوعیت کی تشریح بعد میں ہوگی۔ آپ کے متعلق امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ **ان امیر المؤمنین علیہ السلام اعتق الف مملوک من کدیدہ** ''حضرت امیرؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کیے''۔

ظاہر ہے کہ ایک ہزار غلاموں کی خریداری کسی معمولی سرمایہ سے نہیں ہوسکتی، پھر کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دست و پا کی کدوکاوش سے سرمایہ حاصل کرنا زہد و تقویٰ اور ترک دنیا کے خلاف ہے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے تھے کہ **کان امیر المؤمنین علیہ السلام یخرج في الهاجرة في الحاجة قد کفیها یرید ان یراه الله یعتب نفسه في طلب الحلال** ''امیر المومنینؑ اکثر دوپہر کے وقت ایسے کاموں کے لئے نکلتے تھے کہ اگر کسی اور سے فرمادیتے تو وہ ہوجاتے لیکن آپ چاہتے تھے کہ مال حلال کی طلب میں خود زحمت و مشقت اٹھائیں۔''

آپ کے بعد بھی دیگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت میں اس قسم کے نمونے موجود ہیں۔ عبد الاعلیٰ مولی آل سام کا بیان ہے کہ ایک شدید گرمی کے دن میں میں نے امام جعفر صادقؑ کو مدینہ کے بعض کوچوں میں دیکھا **فقلت جعلت فداک حالک عند الله عزوجل وقرابتک من رسولؐ الله وانت تجهد نفسک في مثل هذا الیوم** میں نے عرض کیا کہ میری جان آپ پر نثار، آپ خدا کی بارگاہ میں جو قرب و منزلت اور رسالتمآب سے جو اختصاص رکھتے ہیں وہ معلوم ہے پھر باوجود اس کے آپ ایسے گرم وقت میں اتنی زحمت و مشقت اٹھا رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا **یاعبد الاعلیٰ خرجت في طلب الرزق لاستغنیٰ به عن مثلک** ''میں تحصیل معاش کے لئے نکلا ہوں اس غرض سے کہ کسی کا محتاج نہ ہوں'' ابوعمر و شیبانی کی روایت ہے **رأیت أباعبدا الله وبیده مسحاة وعلیه ازار غلیظ یعمل في حائط له والعرق تیصات عن ظهره** میں نے امام جعفر صادقؑ کو دیکھا، حضرت کے ہاتھ میں ایک بیلچہ ہے اور آپ موٹا لباس پہنے ہوئے اپنے ایک باغ میں مصروف کار ہیں اور پسینہ حضرت کی پشت سے ٹپک رہا ہے۔ ''**فقلت جعلت فدک اعطنی اکفک**'' میں نے عرض کیا خدمت میرے سپرد ہو، میں انجام دوں گا'' حضرت نے فرمایا **إني أحب ان یتاذی الرجل بحر الشمس في طلب المعیشة** ''مجھ کو اچھا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دھوپ کی ایذا کو برداشت کرے اپنے معاش کی تلاش میں''۔

فضل بن ابی حرہ کا بیان **دخلنا علی ابی عبدالله علیہ السلام في حائط فقلنا له جعلنا الله فداک وعنا نعمل لک او تعمله الغلمان قال لادعوني فإني اشتهی، أن یراني الله عزوجل اعمل بیدي واطلب الحلال في اذیٰ نفسي** ''ہم امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب حضرت ایک باغ میں مشغول کار تھے ہم نے عرض کی کہ ہم کو اجازت دیجئے ہم اس کام کو کریں یا غلاموں کو حکم دیجئے حضرت نے فرمایا: 'نہیں مجھ کو

چھوڑ دو اس لئے کہ میں چاہتا ہوں کہ خداوند عالم کی نظر مجھ پر پڑے اس حالت میں کہ میں اپنے ہاتھ سے کام کر رہا ہوں اور اپنے نفس کو ایذا پہنچا کر کسب حلال کرتا ہوں۔''

درحقیقت یہ خیال کہ کسب معاش میں وقت صرف کرنا اور اس سلسلہ میں کدوکاوش کرنا ترک دنیا کے خلاف ہے اور زہد وتقویٰ کے منافی ہے اُس زمانہ میں بھی اکثر سطحی اور ظاہر بیں زہدوتقویٰ کے حقیقی معیار سے ناواقف اور حقیقت کو مجاز میں محدود سمجھنے والے افراد کے دل ودماغ میں موجود تھا اور اس کی صحت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اس سلسلہ میں امام پر اعتراض کر دینے کو بھی جائز سمجھتے تھے جو اُن کی معرفت کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے چنانچہ میں اس کی بہترین سند محمد بن منکدر کے واقعہ کو سمجھتا ہوں۔ یہ بزرگ اپنے زمانہ میں مشائخ اہل تصوف اور تارکین دنیا کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے۔ اُن کا خود بیان ہے کہ میں نے محمد بن علیؑ یعنی امام محمد باقرؑ کو دیکھا فاردت ان اعظه فوعظني میں نے یہ چاہا کہ حضرت کو موعظہ ونصیحت کروں لیکن نتیجہ میں حضرت نے خود میری ہدایت فرمائی فقال له اصحابه بأي شئ وعظک لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا واقعہ ہے؟ کیونکر اُنھوں نے آپ کی ہدایت فرمائی فقال خرجت إلى بعض نواحي المدينة في ساعة حارة فلقاني ابو جعفر محمدبن علي وكان رجلا بادنا ثقيلا وهو متكئ على غلامين اسودين او مرليين فقلت في نفسي سبحان الله شيخ من اشياخ قريش في هذه الساعة على مثل هذه الحالة في طلب الدنيا أماإني لاعظنه کہا میں بعض اطراف مدینہ میں ایک انتہائی گرم وقت میں کسی ضرورت سے نکلا، راستہ میں مجھ کو امام محمد باقرؑ ملے اور حضرت ذراتنومند اور جسیم تھے اس وقت دو غلاموں کے سہارے سے جارہے تھے میں نے اپنے دل میں کہا 'اللہ اکبر! ایک اتنا بڑا بزرگ مرتبہ شخص بزرگار قریش میں سے اس وقت ایسی حالت میں طلب دنیا میں مصروف ہے، تو سہی جو میں ان کو اس وقت موعظہ کروں فدنوت منه فسلمت عليه فرد على يبهر وهو يتصاب عرفا'' میں حضرت کے قریب گیا اور سلام کیا حضرت نے جواب سلام دیا اس حالت میں کہ سانس آپ کی پھولی ہوئی تھی اور پسینہ ٹپک رہا تھا فقلت اصلحک الله شيخ من اشياخ قريش في هذه الساعة على هٰذه الحالة في طلب الدنيا ارأيت لوجآء اجلک وأنت على هٰذه الحال میں نے کہا کہ خدا آپ کے امور کی اصلاح کرے ایک بزرگ مرتبہ آدمی بزرگان قریش میں سے اور وہ اس وقت ایسی حالت میں دنیا طلبی میں مصروف ہو؟ غور کیجئے اگر ایسی حالت میں آپ کو پیغام موت پہنچ جائے تو کیا ہوگا۔

فقال لو جاء في الموت وأنا على هذه الحال جاء في وأنا في طاعة من طاعات الله عزوجل اكف بها نفسي وعيالي عنک وعن الناس وإنما كنت اخاف لو جاء في الموت وأنا على معصية من معاصي الله حضرت نے فرمایا اگر مجھ کو موت آئے اس حالت میں تو حرج کیا ہے اس لئے کہ اس صورت میں وہ موت مجھ کو آئی ہوگی اطاعت الٰہی میں مصروفیت کے عالم میں، جس کے ذریعہ سے میں اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوسروں سے بے نیاز کرنا چاہتا ہوں، بے شک ڈرتا تو میں اُس وقت جب مجھ کو موت آتی درانحالیکہ میں کسی معصیت میں معاصی الٰہیہ میں مصروف ہوتا فقلت صدقت يرحمک الله اردت ان اعظک فوعظتني میں نے کہا' آپ نے سچ فرمایا، میں نے تو چاہا تھا آپ کو موعظہ کروں حقیقۃً آپ ہی نے مجھ کو ہدایت فرمائی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ترک دنیا کا معیار عام نظروں میں کیا تھا اور امامؑ نے اُس کو کس طرح سے غلط ثابت کیا؟

اسی بناء پر برابر اپنے اصحاب کو کسب معیشت کی تاکید فرماتے رہتے تھے اور مخصوص طور سے تجارت کی طرف کہ جو تمام ذرائع کسب معیشت میں اہم درجہ رکھتی ہے توجہ دلاتے رہتے تھے اور دل نشیں الفاظ میں اُس کے فوائد ومنافع کو گوش گذار فرماتے تھے۔ چنانچہ امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں تعرضوا

التجارة فإن فيها غني لكم عما في ايدي الناس ''تجارت کے لئے جدوجہد کرو اس لئے کہ اس صورت میں تم دوسروں کے محتاج نہ رہو گے۔''

اگر غور کیجئے تو امامؑ نے اس مختصر جملہ میں تجارت کے تمام اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈال دی ہے اور جہاں تک غور کیا جائے اُس میں بیش از بیش معانی نظر آتے ہیں۔

فضیل بن یسار کی روایت ہے قلت لابي عبدالله علیہ السلام إني قد كففت عن التجارة و امسكت عنها قال ولم ذلک اعجزیک كذلک تذهب اموالكم میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میں نے تجارت سے ہاتھ اٹھالیا ہے اوراس کوترک کردیا ہے۔ حضرت نے فرمایا اور یہ کس لیے؟ کیا تم میں کمزوری پائی جاتی ہے؟ اس طرح تو تم لوگوں کے تمام اموال تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔

یہ مختصر فقرہ کہ كذلک تذهب اموالكم تمام اس بیان کا لب لباب اور جوہر اصلی ہے جس کو میں نے مسلمانوں کے اقتصادی مرض میں طویل بیانات کے ساتھ واضح کیا ہے، وہی درآمد وبرآمد کا سوال اور مسلمانوں کے داخلی سرمایۂ حیات یعنی اموال کا غیر اقوام کے پاس پہنچنا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام موروثی وقدیمی نہفتہ واندوختہ سرمایوں کا ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے خزانوں میں چلا جانا۔ یہی وہ ہے جس کو امامؑ نے ترک تجارت کے نتیجہ میں ذکر فرمایا ہے۔

ترک تجارت کے مضر نتیجہ میں امامؑ کا یہ ارشاد کہ اس طرح تمہارے اموال ہاتھ سے نکل جائیں گے اس کا قوی ثبوت ہے کہ افراد کا قوم کے پاس اموال کا ہونا اور دوسرے اقوام سے اموال کا محفوظ رہنا مذہبی تعلیمات کی رو سے قابل لحاظ اور ممدوح مطلوب ہے اور ترک دنیا کے مفہوم سے اُس کا کوئی تضاد نہیں ہے۔

فضل ابن ابی قرہ کی روایت ہے سأل ابو عبد الله علیہ السلام عن رجل و أنا حاضر فقال ماجلسه عن الحج فقيل ترک التجارة قل شيئه قال و كان ستكنا فاستوىٰ جالسا ثم قال لهم لا تدعوا التجارة فهونوا اتجروا بارک الله لكم امام جعفر صادقؑ نے ایک شخص کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ اب کی حج کو کیوں نہیں آیا کسی نے کہا کہ اُس نے تجارت ترک کردی ہے اور اُس کا سرمایہ بہت کم ہوگیا ہے، یہ سننا تھا کہ حضرت یا تو تکیہ سے لگے ہوئے بیٹھے تھے یا سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''دیکھو تم کبھی تجارت ترک نہ کرنا ورنہ ذلیل ہوجاؤ گے۔ تجارت کرو خدا برکت عطا فرمائے۔''

بیشک عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے یہ ارشاد کہ لا تدعوا التجارة فتهونوا تجارت نہ چھوڑنا نہیں تو ذلیل ہوجاؤ گے۔

بیشک یہی وہ منظر ہے جس کو ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ مسلمان اب اقوام عالم کی نظروں میں ذلیل ہیں اور کیوں؟ اسی لئے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کیا، تجارت کو ترک کردیا جس پر اُن کی حیاتِ قومی کا دارومدار تھا۔

اسباط بن سالم کی روایت دخلت علی ابی عبدالله علیہ السلام فسألنا عن عمربن مسلم مافعل فقلت صالح ولكنه قد ترک التجارة قال ابوعبدالله عمل الشيطان ثلثا اماعلم ان رسول الله اشترىٰ عيرا اتت من الشام فاستفضل فيهاما قضىٰ دينه وقسم في قرابته بقول الله عزوجل رجال لاتلهيهم تجارة ولابيع عن ذكر الله الى اخر الاية يقول القصاص ان القوم لم يكونوا يتجرون كذبوا ولكنهم لم يكونوا يدعون الصلوة في ميقاتها وهم افضل ممن حضر الصلوة ولم ينجر۔

میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے ہم سے عمر بن مسلم کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا اچھے ہیں۔ مگر انہوں نے تجارت کو ترک کردیا۔ یہ سُن کر حضرت نے تین مرتبہ فرمایا کہ یہ شیطانی طرز عمل ہے۔ کیا اُس کو نہیں معلوم کہ رسالت مآبؐ نے شام سے آئے ہوئے مال تجارت کو خرید فرمایا اور اُس میں فروخت کے بعد اتنا نفع حاصل

کیا کہ اپنے قرضہ کو ادا کیا اور اپنے اعزہ کی اعانت فرمائی، خداوند عالم نے کچھ لوگوں کی مدح کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے، وہ لوگ ایسے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی۔ عام افسانہ گویوں کا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو تجارت نہ کرتے تھے، لیکن یہ بالکل غلط ہے، بلکہ یہ لوگ تجارت کرتے تھے اور پھر بھی نماز کو اُس کے اوقات میں ادا کرنے کے پابند تھے اور یہ افضل ہیں اُن لوگوں سے جو نماز میں شریک ہوتے تھے مگر تجارت نہ کرتے تھے۔

اس حدیث سے جس طرح یہ ظاہر ہے کہ ترک تجارت عمل شیطانی کہنے کا مستحق سمجھا گیا ہے اُسی طرح تجارت میں مشغولیت کی حد افراط وتفریط کا بھی پتہ لگ گیا۔ تجارت میں مصروفیت اس قدر کہ فرائض الٰہیہ میں فروگذاشت ہو اُس کا مذموم پہلو ہے، جس طرح تجارت کا ترک کردینا اگرچہ عبادات الٰہیہ میں مصروفیت کی جہت سے ہو قابل مدح صفت نہیں، بلکہ انسان تجارت کے ساتھ ساتھ فرائض الٰہیہ کی بجا آوری کا خیال رکھے تو یہ اُس کی کامیابی اور قابل مدح زندگی کہی جاسکتی ہے۔

اب غالباً اس خیال کی کوئی گنجایش نہیں رہی کہ کسب حلال اور طلب معیشت وغیرہ میں مصروفیت ترک دنیا کے خلاف یا زہدو تقویٰ کے منافی ہے لیکن زیادتی اطمنان کے لئے یہ دو حدیثیں بھی نذر ناظرین ہیں جن میں صریحی طور سے زہد کا معیار بتلا دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو سکونی کی روایت امام جعفر صادقؑ سے **قلت له ما لزّهد في الدنيا قال ويحك حرامها فتنكبه** ''میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ زہد فی الدنیا کے معنی کیا ہیں؟ حضرت نے فرمایا یعنی دنیا کا مال حرام، اُس سے اجتناب کرو''۔

دوسری حدیث اسمٰعیل بن مسلم کی روایت **قال ابو عبدالله ليس الزهد في الدنيا باصناعة المال ولا تحريم الحلال بل الزهد في الدنيا ان لا تكون بما في يدك اوثق منك بما عندالله عز وجل** ''زھد فی الدنیا کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان خواہ مخواہ مال دنیا کو اپنے ہاتھ سے جانے دے اور حلال کو بھی اپنے اوپر حرام سمجھ لے بلکہ زہد یہ ہے کہ انسان دنیاوی اموال پر اتنا اعتماد نہ کرے کہ آخرت کے معاملہ میں کوتاہی کرنے لگے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسب حلال اور جائز ذرائع سے طلب معیشت کسی طرح زہدوتقویٰ کے خلاف نہیں ہے اور نہ وہ شریعت اسلامی کے اعتبار سے کسی طرح قابل اعتراض سمجھا جاسکتا ہے۔

ترک دنیا کا روشن پہلو:

امیر المومنین علیہ السلام کے ترک دنیا کی نوعیت

دنیا کو تین مرتبہ طلاق دینے کا صحیح مفہوم

اب تک جو کچھ بھی کہا گیا وہ اس خیال کا دفعیہ تھا کہ انسان کا کسب معاش میں کوشش اور تحصیل مال میں جدوجہد کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، ہم نے مکمل طور سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ اسلام ہرگز دنیاوی اموال کی تحصیل اور کسب معاش میں کوشش کو جو جائز طریقوں سے ہو مذموم نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ جس طرح انسان کے لئے اپنی اخروی زندگی کے لئے سامان فراہم کرنے کو اہم فرض قرار دیتا ہے اسی طرح اپنی انفرادی واجتماعی دنیاوی زندگی میں بھی سعی وکوشش کو انسان کے فرائض میں داخل کرتا ہے لیکن اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری اور ذرائع کسب معاش سے سرمایہ کی فراہمی کے بعد اُس کو کرے کیا؟ ایک صورت یہ ہے کہ انسان اموال دنیا کو جمع کرے، سرمایۂ شخصی کی فراوانی میں انتہائی جدوجہد صرف کرے، طلاونقرہ کے انبار لگائے اور زروجواہر سے خزانے پر کرے لیکن اس کی منفعت اُس کی ذات تک محدود رہے۔ اُس کے جسم پر بہتر سے بہتر لباس ہو، اُس کے دسترخوان پر لذیذ سے لذیذ غذائیں ہوں، اس کے دروازہ پر حشم وخدم ہو، اُس کے گرداگرد خدام و ملازمین کا ہجوم ہو اُس کی زندگی شاہانہ اور اُس کا سازوسامان ملوکانہ ہو اور اُس کے بعد بھی جو کچھ باقی رہے وہ صندوقوں

میں مقفل اور خزانے کے بند دروازوں میں محفوظ، حیات کے آخری لمحوں تک ہر کس وناکس کی نگاہ سے پوشیدہ ومستور باقی رہے، لیکن نہ اُس سے خلق خدا کو کوئی فائدہ ہو، نہ قومی ومذہبی امور پر اُس کے احسانات کا بار پڑے اور نہ کسی غیر تک اس فیض کا اثر پہنچے۔ یہ ہے افسوسناک سرمایہ داری جس میں اکثر وبیشتر ارباب دولت واقتدار مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جتنی تعداد میں بھی ہو جائیں کبھی قومی ترقی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ اُن کی ترقی ہمیشہ انفرادی ہوگی۔ جس کا قوم کے نظام اجتماعی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے بالکل برخلاف دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری کرے۔ کسب معاش میں زحمت اُٹھائے، لیکن اپنے حاصل کردہ اموال کو صرف اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے وہ فقراء ومساکین کی خبر گیری کرے۔ قومی و مذہبی کاموں کی انجام دہی کرے۔ اور خیر وخیرات، اوقاف وصدقات کے ذریعہ سے اپنے قومی نظام اجتماعی کے ترقی دینے میں مصروف رہے۔ اُس کا لباس فقیرانہ ہو، اُس کا طعام گدایانہ ہو، اُس کا طرز زندگی محتاجانہ ہو لیکن اس کے ہاتھوں سے بھوکوں کو کھانا پہنچتا ہو۔ فقیروں کو لباس ملتا ہو اور محتاجوں کو اُن کی زندگی کا سامان مہیا ہوتا ہو۔

بیشک یہ ہے ترک دنیا کا روشن پہلو جس کی تفسیر یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنی ذات پر صرف نہ کرے۔ مگر اس قدر کہ جو اُس کی زندگی کے لیے کم سے کم مقدار میں ضروری ہو اور باقی سب خلق اللہ کی بہبودی ومنفعت رسانی میں صرف کر دے۔ یہ ترک دنیا اجتماعی ترقی کا کامیاب ذریعہ اور نظام اجتماعی کا شیرازۂ محکم ہے۔ ایسے تارکِ دنیا اشخاص کا وجود باعث پستی نہیں بلکہ قوم کو بلند سے بلند معراج ترقی پر پہنچانے کا ضامن ہے۔

اکثر باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نتیجتاً متحد ہیں، لیکن صورت و نوعیت اور اسباب ومقدمات کی بناء پر اس میں ممدوح ومذموم ہونے کی حیثیت سے تفرقہ ہو جاتا ہے۔ پھٹا ہوا لباس، روکھی سوکھی روٹی، محتاجی وبے سروسامانی، ایک چیز ہے۔ لیکن یہ کبھی بیکاری وعاجزی کا نتیجہ ہوتی ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ دنیا میں کوئی کام ہی نہ کیا۔ اور نہ کبھی تحصیل معیشت میں کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوسروں کا دست نگر ومحتاج رہا اور نکبت وافلاس کی بلا میں گرفتار ہوا۔ یہ محتاجی وبے سروسامانی کبھی مدح وثنا کے قابل نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ تحسین وآفرین کی مستحق ہے۔ اس صورت سے محتاج رہنے والا خدا کی دی ہوئی نعمت کے کفران اور اُس کی عطا کی ہوئی طاقتوں کی ناقدر شناسی کا مرتکب ہے اور اگر ترک دنیا کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے تو وہ غلط ہے، اور اسلامی تعلیمات کے خلاف۔ لیکن کبھی یہ بے سروسامانی وپریشانی اس امر کا نتیجہ ہے کہ انسان نے تحصیل معاش میں جد وجہد اور کسب معیشت میں کد وکاوش کی اور کرتا ہے اور اُس میں کامیاب بھی ہوا، لیکن جو کچھ ملتا ہے اُس کو اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے دوسروں پر صرف کرتا ہے۔ خود بھوکا رہتا ہے، لیکن دوسروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ خود پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ لیکن بہتیروں کو لباس پہنا دیتا ہے۔ خود فقیروں کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن کتنے فقراء کی زندگی کا سامان کر دیتا ہے۔ یہ فقر وفاقہ اور پریشان حالی وہ ہے جو روح عزت اور جوہر کمال ہے۔ اس کا نام ہے ایثار، اس کا نام ہے مواسات، وہ پھٹا ہوا لباس شاہوں کے تاج سے زیادہ وقیع اور سوکھی روٹی سلاطین کے خوان نعمت سے زائد باوقار ہے اور اس فقر وفاقہ میں وہ جاہ وجلال ہے۔ جو ارباب دولت واقتدار اور اہل ثروت وسرمایہ کو نصیب نہیں۔

یہ ترک دنیا وہ ہے جس کو مکمل صورت سے امیر المومنین علی ابن ابی طالب نے پیش کیا تھا وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے تھے، انہوں نے اموال دنیا کے حاصل کرنے اور کسب معیشت میں کد وکاوش کو ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے دست وبازو اور قوت وطاقت کو بیکار نہیں رکھا تھا۔ لیکن اس مال کو انہوں نے کیا کیا؟ خود فاقوں پر فاقے کیے، پھٹا ہوا پیوند دار لباس پہنا، فقراء کی سی زندگی بسر کی، لیکن مظلوموں کی گلوخلاصی کی، فقراء کی خبر گیری

اورغرباء کومنفعت رسائی فرمائی اُن کے متعلق یہ حدیث سابق میں گذر چکی ہے کہ **ان امیر المؤمنین اعتق الف مملوک من کدیدہ** ''امیر المومنینؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کئے۔'' اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے اسی سرمایہ سے عمدہ مکان بنوالیتے اچھے اچھے لباس تیار کراتے اور لذیذ کھانے کھاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اُن کا معیار نظر اس سے بہت بلند تھا۔ انہوں نے دنیاوی لذائذ سے خود متمتع ہونا کبھی گوارانہ کیا۔ اور نہ سونے چاندی کے انبار لگا کر خزانوں کا منھ بھرا، اُن کا قول تھا کہ **یا صفراء یا بیضاء غرّی غیری** ''اے سنہرے روپہلے دل لبھانے والے سکّو۔ کسی اور کو جا کر فریب دو، مجھ پر تمہارا جادو نہیں چل سکتا''۔

ان کا ارشاد تھا: ''**طلقتک ثلاثا لا رجعۃ بعدھا** اے دنیا میں نے تجھ کو تین طلاق دیا ہے جس کے بعد رجوع ممکن نہیں۔''

ہر زبان کے کچھ محاورات ہوتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر مجاز یا کنایہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت کے تمام خواص ولوازم کا تلاش کرنا اُن کے اصلی مفاد سے علٰیحد گی ہو جانے کا مرادف ہے۔ کسی کی اولاد جاتی ہے تو وہ کہتا ہے میری تمام عمر کی کھیتی برباد ہوگئی۔ اب کیا اُس سے دریافت کیا جائے گا کہ کھیتی کہاں تھی، وہ کس زمین پر تھی اور اُس میں پانی کس طرح دیا جاتا تھا۔ اور جو کچھ کھیتی کے لوازم ہیں وہ اُس میں کب موجود تھے؟ ہرگز نہیں بلکہ کھیتی برباد ہونا صرف اسی اعتبار سے ہے کہ تربیت اور نشوونما کے حصول میں محنت کی گئی اور وہ ضائع ہوگئی۔

کبھی کہتا ہے کہ میرا چراغ گل ہوگیا۔ اب کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ چراغ دن کو خاموش اور رات کو روشن کیا جاتا ہے تو وہ فرزند بھی اسی صورت سے دن کو مخفی رات کو ظاہر رہتا تھا۔ حسین سے چہرے کی تشبیہ آفتاب سے صحیح ہے لیکن اس کے رہنے کے لئے چرخ چہارم کی ضرورت نہیں اور رخسار کی تعبیر گلاب سے درست ہے مگر اس میں خوشبو کے تلاش کی حاجت نہیں ہے۔

امیر المومنین کا ارشاد کہ **طلقتک ثلثا لا رجعۃ بعدھا** 'میں نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دیا، جس کے بعد رجوع نہیں' حقیقی اعتبار سے تو ہے نہیں اس لئے کہ طلاق عورت سے مخصوص ہے جو بطریق عقد دائم انسان کی زوجیت میں داخل ہوئی ہو اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا نہ کوئی مجسمہ ہستی ہے۔ نہ وہ نوع انسانی کی کسی صنف میں داخل ہے جو عورت کہی جا سکے اور اُس سے تعلقات ازدواج کا قطع کرنا حقیقی معنی میں طلاق ہو۔ بلکہ یہ صرف استعارہ کی صورت سے ارشاد ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ عورت جس کو تین مرتبہ طلاق دیا جا چکا ہو، انسان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہے اور کبھی اُن میں تعلقات قائم نہیں ہوتے، اُسی طرح مجھ کو تجھ سے ایسی بے تعلقی ہے جو تغیر و تبدل کے قابل نہیں ہے۔

اب یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ طلاق اُس وقت صحیح ہے جب انسان تعلقات ازدواج رکھتا ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ کا دامن کبھی دنیا سے ملوث ہوا تھا۔ نیز طلاق بائن ہمارے مذہب کی بنیاد پر اس وقت ہوتا ہے جب ایک مرتبہ طلاق دے کر پھر رجوع کرے اور پھر طلاق دے اور پھر رجوع کرے۔ اسی صورت سے جب تیسری مرتبہ طلاق دے تو پھر وہ عورت بائن ہو جاتی ہے تو کیا امیر المومنینؑ کے طرز عمل میں بھی دنیا کے ساتھ یہ انقلابات و تغیرات ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا سے مراد اگر دنیائے ممدوح ہے تو اُس کو طلاق دینے کے کیا معنیٰ؟ اور اگر دنیائے مذموم ہے تو اُس سے ملوث ہونے کا کیا موقع تھا جو طلاق کی ضرورت ہوتی؟

ان تمام خیالات کی بنیاد اسی پر ہے کہ طلاق کے مفہوم کو حقیقی معنیٰ میں سمجھ کر اُس کے تمام لوازم کی جستجو کی جائے۔ لیکن حقیقت امر جیسا کہ میں نے بیان کیا اس طرح نہیں ہے بلکہ اپنی کامل بے تعلقی کی تشبیہ مطلقہ ثلاث یعنی تین مرتبہ طلاق دادہ شدہ عورت سے ہمیشہ کے قطع تعلق کے ساتھ دینا منظور ہے جس میں وجہ مشترک اور سبب مشابہت آئندہ کی بے تعلقی ہے، نہ سابق کے تعلقات۔

اب یہ بے تعلقی ہے کس وقت سے؟ اس کی تو تحدید نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ کہا گیا کہ اب میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں تاکہ شبہ پیدا ہو سکے قبل کے تعلقات کا، بلکہ ارشاد کیا طلقتک ثلثا میں تجھ کو طلاق دے چکا ہوں یعنی اتنی بے تعلقی کر چکا ہوں جو تین مرتبہ طلاق دینے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اب یہ سمجھنے کا حق باقی ہے کہ اس بے تعلقی کی ابتدا، ابتداء فطرت اور آغاز تخلیق سے شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کسی خاص زمانہ کی حد مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ تھا وہ ترک دنیا جس کو امیر المؤمنینؑ نے کیا تھا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ مال دنیا کی تحصیل اور کسب معیشت کی جدوجہد ہی ناقابل معافی الزام اور مستوجب مذمت جرم ہے، بیشک طلب دنیا اگر صرف ذاتی منفعت رسانی اور لذت کشی و خودنمائی و خودستائی کے لئے ہے تو وہ قابل نفرت سرمایہ داری ہے مگر جب وہ خلق خدا کی بہبودی اور منفعت نوعی کے لئے ہو تو وہ قابل مدح وستائش ہے اور اس پر واضح الفاظ میں معصوم نے روشنی ڈالی ہے جب کسی شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: **واللہ انا لنتطلب الدنیا و نحب ان نوعتاھا** خدا ہم میں دنیا طلبی پائی جاتی ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ دنیا ہمارے ہاتھ آتی۔"

حضرت نے فرمایا **تحب ان تصنع بھا ماذا** یہ تو بتلاؤ کہ تم دنیا کو حاصل کر کے کرنا کیا چاہتے ہو؟" **قال اعود بھا علی نفسی و عیالی و اتصدق بھا و احج و اعتمر** "عرض کیا یہی کہ دنیا کو حاصل کر کے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے اسباب زندگی مہیا کروں اور لوگوں کو خیرات دوں اور حج وعمرہ بجالاؤں" حضرت نے فرمایا **لیس ھذا طلب الدنیا ھذا طلب الآخرۃ** پھر یہ تو دنیا طلبی نہ ہوئی بلکہ یہ حقیقۃً آخرت کی طلب ہے۔"

اب بھی کیا زیر بحث مسئلہ میں کوئی گنجلک باقی رہ گئی؟ کیا یہ خیال اب حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے کہ طلب معیشت میں کوشش اور تحصیل مال حلال میں جدوجہد ہی ترک دنیا کے منافی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کیا اس امر میں کوئی شبہہ باقی رہ گیا کہ اسلام اُس صورت سے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے ترک دنیا کا حامی نہیں ہے بلکہ اس طرح کا ترک دنیا نظام اجتماعی اور مفاد ملی اور مصالح قومی کے ساتھ سخت ترین دشمنی اور بے انصافی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دیتا۔

دوسرا خیال اور اُس کا دفعیہ: مسئلہ تقدیر کا حل اور خدا کو رازق سمجھ کر کسب معاش کو غیر ضروری سمجھ لینے کا ابطال

ایک دوسرا خیال جو بہ اعتبار اپنے نتائج اور مضر اثرات کے پہلے خیال سے زیادہ مہلک اور سمیت آمیز ہے لیکن اکثر دماغوں میں راسخ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیاوی حوادث اور انسانی حالات کا تغیر و تبدل قضا و قدر الٰہی کا پابند ہے اور جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی تقدیر پر جو مشیت باری کا نتیجہ ہے مستقبل کا دارومدار ہے تو اب انسان جدوجہد کرے دست و پا کو حرکت دے، میدان عمل میں سعی و کوشش کرے یا یہ کچھ نہ کرے۔ بہرحال جو کچھ ہونے والا ہے۔ اُس کے لئے وہ ہوگا۔ تو پھر اس تمام کدوکاوش کی ضرورت اور سعی کی حاجت؟ کچھ بھی نہیں بلکہ انسان خدا کی مشیت سے لو لگائے بیٹھا رہے اور جو کچھ اُس کی جانب سے ہو اچھا ہو یا برا اُس کا بہ کشادہ پیشانی استقبال کرے، مخصوص طلب معیشت وغیرہ کے متعلق اس خیال کو دوسری لفظوں میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ خدا رازق ہے اور اُس نے ہر ذی روح کے لئے رزق مقرر فرما دیا ہے، وہ رزق ملے گا ضرور خواہ انسان جدوجہد، سعی و عمل کرے یا نہ کرے۔

تو اب دوکانداری، پیشہ وری، کاشتکاری، دستکاری وغیرہ وغیرہ جتنے ذرائع کسب معیشت ہوں، سب بے نتیجہ اور عبث ہیں۔ کیونکہ وہ نہ مقررہ رزق میں زیادتی کر سکتے ہیں اور نہ انسان کا صبر و سکون اور خاموشی اور ان کے ذرائع سے کنارہ کش ہونا اُس میں کمی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ رازق ہے اور جب وہ رازق ہے

تو رزق عطا کرے گا ضرور، انسان اُسی پر اعتماد کئے بیٹھا رہے اور یہی معنی ہیں توکل کے جو مذہبی تعلیمات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہ ہے وہ خیال جو اکثر خوش عقیدہ اور پاک طینت لیکن سادہ لوح مسلمانوں کے ذہن میں قائم ہوگیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی حقیقۃً معرفت قضا وقدر اور مذہبی معارف وتعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

مذکورۂ بالا نظریہ یا خیال کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ افراد خود اپنے دورحیات اور نظام زندگی میں کسب معاش کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اس عقیدہ پر کہاں تک عامل نظر آتے ہیں اور اس سے معلوم ہوگا کہ وہ افراد جو اس عقیدہ کے داعی و مبلغ ہیں خود اپنی عملی زندگی میں اس کی مخالفت پر مجبور ہیں۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ لہٰذا انسان کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، اگر کلیہ کے طور پر بالکل صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو کسی مقصد کے حصول میں کسی قسم کی بھی جدوجہد حق بجانب اور ضروری نہ ہو۔ مریض مبتلائے مرض ہو اور تیاردار خواب استراحت میں رہے، طبیب کی طرف رجوع اور مرض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز اور دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہووے ہی گا۔

سامنے سے شیر کے ہمہمہ کی آواز اور اُس کی آمد اور انسان فرار کرنے پر قادر لیکن ہاتھ پاؤں کو حرکت نہ دے اس لئے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہی ہوگا۔ بھوک کی شدت اور سامان غذا گھر میں موجود لیکن اٹھ کر پکانا، سامنے لانا، ہاتھ کو گردش دینا اور لقموں کا دہن تک لے جانا سب بیکار، اس لئے کہ اگر سیر ہونا مقدر میں ہے تو ضرور ہوگا۔ اور پھر خدا رازق ہے۔ رزق پہنچائے گا ضرور۔ ہاتھ پیروں کو حرکت دینے کی کیا ضرورت۔

کسی مقصد کے لئے پہنچنا ضروری مثلاً واعظ کی تقریر سننے کا اشتیاق، لیکن کپڑے پہننا، گھر سے باہر نکلنا، قدم قدم راستہ قطع کرنا یہاں تک کہ جلسہ میں جا کر بیٹھنا اور زحمت گوارا کرنا، سب فضول اس لئے کہ تقریر کی سماعت ہونا ہے تو ہوگی، اس تمام جدوجہد کی ضرورت کیا؟۔

بیشک اگر ہر چیز قضاؤ قدر کی بناء پر اس طرح ہوتی ہے کہ انسانی جدوجہد کے ہونے نہ ہونے کو اُس میں دخل نہیں تو اس میں یہ اور ان کے ایسے ہزاروں نتائج پیدا ہونا ناگزیر ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں عالم انسانی کے ہر جز وکل کی سیرت زندگی اور طرز عمل کے خلاف ہے۔ وہی لوگ جو بلند بانگ آواز سے قضا وقدر الٰہی کا نام لے کر اپنے کو طلب حلال اور کسب معیشت کے فرائض سے سبکدوش بنانا چاہتے ہیں وہ بھی دوسرے زندگی کے شعبوں میں اس کلیہ پر قائم نہیں رہتے، کوئی بیمار ہوتا ہے، تو اُس کا علاج کرتے ہیں، بھوک لگتی ہے تو کھانا پکواتے ہیں اور کھاتے ہیں، کوئی ضرورت ہوتی ہے تو خود راستہ قطع کرتے اور اُس جگہ جاتے ہیں، کوئی دشمن حملہ کرتا ہے تو مدافعت کرتے ہیں۔ غرض ہر شے کے لئے جو اُس کے اسباب ہیں ان کو خود اپنی عملی جدوجہد سے مہیا کرتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ہم کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، جو ہونا ہے وہ ہوگا، لیکن ادھر کسب معاش کا مسئلہ پیش ہوا اور بڑے خدا پرست وتوکل پیشہ بن کر فرمانے لگے کہ جتنا مقدر میں ہے وہ خدا دے گا ضرور، محنت کریں یا نہ کریں۔

کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف بیکاری زندگی اور طلب معیشت میں عاجزی و درماندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ ایک بہانہ ہے جو مذہبی عقیدہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ عقیدہ پر سچا ایمان ہوتا تو اُس کا اثر زندگی کے دسرے شعبوں میں بھی ضرور نظر آتا، اب مجھ کو یہ دیکھنا ہے کہ حقیقۃً یہ خیال قضا وقدر کے مسئلہ کے تحت میں صحیح بھی ہے یا نہیں؟۔

بیشک قضاؤ قدر حق ہے، اور عالم تکوین کا ہر حادثہ قرارداد الٰہی کا پابند ہے اور یقینا جو شے جس صورت سے مقدر ہو اُسی صورت سے انجام پذیر ہونا ضروری ہے۔ لیکن دیکھنا اس بات کا

ہے کہ قضاؤ قدرِ الٰہی جاری کس طرح پر ہوتی ہے۔ اور قرار داد کی نوعیت کیا ہے او تقدیر کس صورت پر قائم ہوتی ہے۔ جس طرح اور جس نوعیت میں اور جس صورت پر قضاؤ قدر کا نفاذ ہوا ہے وہی ہو کر رہے گا اور اُس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ عالم امکان اور دنیا کے مقررہ نظام کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی بنیاد ذرائع واسباب پر قرار دی گئی ہے اور بغیر کسی غیر معمولی مصلحت کے جو اعجاز و کرامت کا باعث ہو اس اصول کی مخالفت نہیں ہوا کرتی۔ ابر آئے تو پانی برستا ہے، آفتاب طالع ہو تو دھوپ نکلتی ہے، آگ ہو تو شعلے اٹھتے ہیں، پانی ہو تو آگ بجھتی ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے پانی پینے کی ضرورت اور بھوک جانے کے لئے کھانا کھانے کی حاجت ہے۔ جو شخص پہاڑ سے ٹکر لگائے، پاش پاش ہوگا۔ آگ میں پھاندے جل کر خاک ہوگا۔ سنکھیا کھالے ہلاک ہوگا۔ سمندر میں پھاند پڑے غرق ہوگا۔ غرض جیسے اسباب وذرائع مہیا ہوں ویسا نتیجہ برآمد ہوگا۔ اور درحقیقت کسی شے کے اچھے بُرے نتائج ظاہر ہونے کی ذمہ داری انسان پر ان ہی اسباب وذرائع سے عائد ہوتی ہے جو ان نتائج کے موجب ہیں اگر چہ خود وہ نتائج انسان سے مجبوری اور بے بسی کے عالم میں نمودار ہوں لیکن وہ اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ان کے اسباب کا ذمہ دار ہے۔

بندوق کا رخ کسی کی طرف کر کے فائر کرنے والا اُس کا قاتل ہے، حالانکہ روح وبدن کا افتراق، نفس کی آمد وشد کا انقطاع، حرکت قلب کا رکنا اور دم نکلنا اس کے ہاتھ کا کام نہ تھا اور گولی کا پڑنا اُس کا در آنا اور سینہ توڑ کر نکل جانا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اور نہ جب وہ گولی ہوا کے دامن میں اور فضا کی آغوش میں پوری قوت کے ساتھ جا رہی تھی تو یہ اُس کے روکنے پر قادر تھا۔ لیکن پھر بھی قاتل یہ ہے اس لئے کہ بندوق کا رخ اُس طرف کر کے اس انداز کی تحریک جس کا نام ہے فائر اس کا کام تھا اور اختیاری کام، اس لئے آخر تک جتنے نتائج ہوں وہ اسی دست وبازو کا کرشمہ ہیں۔

انسان کی کسی خاص نتیجہ پر تعریف یا مذمت بھی ان ہی اسبب کی بناء پر ہوتی ہے جنہیں وہ باختیار خود فراہم کرتا ہے۔ بے شک غیر معمولی حوادث کبھی نتیجہ کو انسان کے مزعومہ اسباب و ذرائع سے علیحدہ بھی کرتے ہیں جس کا کبھی تو یہ باعث ہوتا ہے کہ انسان کی نظر نے اسباب کی تشخیص میں غلطی کی اور جس کو وہ سبب سمجھتا تھا حقیقۃً مذہب ہی نہ تھا فریب نظر تھا اور سراب خیال۔ لہٰذا اسباب ومسببات کے فلسفہ کا قدرتی تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ نتیجہ حاصل نہ ہوا، اور کبھی انسان اسباب مہیا کرتا ہے اور ٹھیک ترتیب سے لیکن قدرت کی طرف سے کوئی غیر معمولی مانع پیدا کر دیا جاتا ہے جو اُن اسباب کی کامیابی میں سد راہ ہو جاتا ہے، یہ کامیابی اور عدم کامیابی انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن اُس کی ذمہ داری اسباب وذرائع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی پر وہ مدح یا قدح تعریف وثنا یا سرزنش وملامت کا مستحق بن جاتا ہے۔

بندوق چلائی اور پوری قوت کے ساتھ اور یہ سمجھ کر کہ فلاں شخص پر جا کر لگے لیکن اتفاق سے نشانہ نے خطا کی اور گولی ہٹ کر پڑی، اس سے وہ شخص بری نہیں ہو سکتا جس نے گولی کا فائر کیا تھا۔ وہ مجرم ہے اور بہر حال مجرم۔ یہ اور بات ہے کہ جو نتیجہ تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ یا اگر وہ حملہ کسی صحیح مقصد سے اور فریضہ کے تحت میں تھا تو گولی لگا کر ہی وہ اپنے فرض سے ادا ہوا اور مدح وثنا کا مستحق بن گیا، کامیابی وعدم کامیابی کا مرحلہ جداگانہ ہے۔ اسی کو عرب کے فلسفی شاعر نے یوں کہا ہے:

علی المرء ان یسعیٰ بمقدارہ جھدہ
ولیس علیہ ان یکون موفقا

انسان اپنی سی کرے، نتیجہ کی ذمہ داری اور کامیابی وعدم کامیابی اُس کے فرض سے خارج ہے۔

رزق اور اُس کے مختلف مراتب یہ بھی اسی مقررہ نظام عالم کے تحت میں ہیں جو اسباب وذرائع کا پابند ہے ابی اللہ الا ان یجری الاشیآء علی اسبابھا۔

خدا نے انکار کیا ہے اس بات سے کہ اشیاء کی رفتار اسباب طبیعہ کے خلاف ہو۔

بیشک مشیت الٰہیہ بدل نہیں سکتی اور خدا کی تقدیر کے خلاف ممکن نہیں، لیکن دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تقدیر الٰہی جاری کس طرح ہوئی ہے؟ اور اگر تقدیر الٰہی مطلق ہے اور غیر مشروط تو اُس کا پورا ہونا بہر حال ضروری ہے، خواہ انسان سعی و عمل کرے یا نہ، کسب معیشت میں زحمت ومشقت اٹھائے یا نہ لیکن اگر تقدیر الٰہی مشروط ہے اور قرار داد یوں ہی ہوئی ہے کہ جب انسان سعی وکوشش کرے اور جدوجہد سے کام لے تو اُسے اتنا رزق عطا کیا جائے، تو اس کا اقتضا یہ ہے کہ بس سعی وکوشش کی صورت میں وہ رزق حاصل ہو بغیر سعی وطلب اور معیشت میں جدوجہد کے اُس رزق کا حاصل ہونا تقدیر الٰہی کے خلاف اور معینہ قرارداد کے منافی ہے۔

اب اگر انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ بیٹھا رہا اور بسر زندگی کے اسباب مہیا کرنے میں کوتاہی کی، نتیجہ میں تنگدستی واحتیاج اور فقر و فاقہ کی مصیبت میں گرفتار ہوا تو اُس کی ذمہ داری خود اُس غلط طرز عمل پر ہے۔ لیکن اگر اُس نے اپنے مقدور بھر جدوجہد کی اور زحمت ومشقت برداشت کی اور اُس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ حاصل ہوا تو وہ تقدیر الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ انسان کا کام کوشش کرنا ہے اور کامیابی عطا کرنا خدا کی طرف سے ہے۔

کوشش کے بعد اگر ناکامی ہو تو پھر انسان پر کوئی الزام نہیں، معلوم ہوگا کہ مصلحت باری یہ ہے کہ کچھ روز تک اُس کو تکالیف برداشت کرنا پڑیں، وہ صبر کا موقع ہے اور اگر کامیابی ہو تو وہ خداوند عالم کی جانب سے ہے اُس پر شکر کا موقع ہے لیکن اگر انسان نے کوشش نہ کی اور اس لئے سختی میں زندگی گذاری تو وہ اس کے ہاتھوں سے ہے اُس پر دوسروں کو ملامت کا موقع ہے۔

حضرت احدیت عز اسمہ نے انسان کی ذمہ داری بالکل اپنے اوپر نہیں لے لی ہے تاکہ انسان کی قوت عمل سلب نہ ہو اور اسباب مہیا کرنے کا وہ ذمہ دار رہے، لیکن ان اسباب میں کامیابی عطا کرنا اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ انسان اپنی قوت عمل پر بھروسا کر کے اپنے کو اس سے بے نیاز نہ سمجھ لے اور اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا رہے۔

وہ رازق ہے یعنی عطا کرنے والا وہی ہے لیکن اُن اسباب کے ذریعہ سے جنہیں انسان کو مہیا کرنا چاہئے اس طرح ایک طرف انسان جدوجہد کے فرض سے سبکدوش نہیں معلوم ہوتا اور دوسری طرف خدا پر توکل کے معنی ظاہر ہوتے ہیں اور اُس کی رازقیت کا عنوان معلوم ہوتا ہے۔ اُس کو رازق سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والے غلط راستے پر ہیں۔ جس طرح وہ جو صرف اپنی ذاتی محنت پر بھروسا کر کے اپنے کو خدا سے مستغنی سمجھنے لگے ہوں۔ کسب معاش میں زحمت ومشقت برداشت کرنے کے بعد محرومی وناکامی سے دوچار ہونا یا دو پیشہ وروں میں جو خاص موقع ووقت، خاص صورت، خاص اسباب وذرائع کے ساتھ مصروف عمل ہوئے ہوں ایک کو زیادہ نفع ہونا اور دوسرے کو کم، اُس خود مختار غیبی طاقت کے کرشمے اور انسانی محدود طاقت پر اعتماد کرنے والوں کے لئے تازیانہ عبرت ہیں لیکن اس ناکامی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنی قوت عمل کے صرف کو بیکار سمجھ کر خاموش رہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حقیقۃً رزق کے مسئلہ میں قضا وَ قدر الٰہی کس صورت پر جاری ہوئی ہے۔ یقیناً اس کو وہی بتا سکتے ہیں جو حقیقت شناس رموز قدرت اور سبق خوان مدرسۂ الوہیت ہوں، جن کو لوح محفوظ کے مندرجہ نقوش اور عالم تقدیر کے تمام کائنات کا براہ راست علم دیا گیا ہو۔ انہوں نے بتلا دیا کہ خدا کی رازقیت کس طرح ہے اور تقدیر الٰہی کی نوعیت کیا ہے اُن کا ارشاد ہے کہ **تسعة عشار الرزق في التجارة** رزق کے فی صدی نوے حصّہ تجارت میں مضمر ہیں اُس کے معنی یہ ہیں کہ بغیر تجارت فی صدی دس حصّہ رزق کا حاصل ہو سکتا ہے لیکن فی صدی نوے حصّہ وہ ہے جو تجارت کے ساتھ مشروط ہے۔

اُن کے ارشادات وہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں

نے اس خیال کی خاص طور پر رد کی ہے کہ خدا کے رازق ہونے کی بنا پر انسان کو جدو جہد کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ انسان پر سعی وکوشش فرض ہے اور اپنے مقدور بھر ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا لازم ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال سادہ لوح افراد کے دل میں آج نہیں بلکہ بہت پہلے زمانۂ رسولؐ میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کی فوراً رد کی گئی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''**ان قوما من اصحاب رسول الله لما نزلت ومن يتق الله يجعل له مخوجا ويرزقه من حيث لايحتسب اغلقوا الابواب وقبلوا على العبادة وقالوا قد كفينا فبلغ ذلک النبیؐ فارسل اليهم فقال ماحملكم على ماصنعتم فقالوا يارسول الله تكفل الله لنا بارزاقنا فاقبلنا على العبادة فقال انه من فعل ذلک لم يسجتب له عليكم بالطلب**''

کچھ لوگ اصحاب رسولؐ میں سے جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے خدا اُس کے لئے کشایش پیدا کرتا ہے اور غیر معلوم طریقوں سے اُس کو رزق عطا فرماتا ہے۔ تو انہوں نے دروازے گھروں کے بند کر لئے اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے اور کہا کہ اب کیا ضرورت! خدا تمہارے رزق کا ذمہ دار ہو ہی گیا یہ خبر جناب رسالتمآب کو پہنچی، حضرتؐ نے اُن کے پاس آدمی بھیجا اور فرمایا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے عرض کیا، یارسولؐ اللہ! خدا نے تو ہمارے رزق کی ذمہ داری کر لی، ہم اُس کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو ایسا کرے اُس کی کوئی دعا خداوند کریم کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم طلب معاش کرو''

اس حدیث سے حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا، اس کے بعد بھی ائمہ معصومینؑ موقع بموقع اِس خیال کی کمزوری کو ظاہر فرماتے اور بتلاتے رہے ہیں کہ انسان کے لئے ظاہری اسباب وذرائع سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو عمر بن یزید کی روایت امام جعفر صادقؑ سے فرماتے ہیں: **رأيت لو ان رجلا دخل واغلق بابه اكان يسقط عليه شيٍ من السماء** تم خود سمجھو کہ اگر انسان گھر میں بیٹھ رہے اور دروازہ بند کر لے تو کیا چھت پھاڑ کر آسمان سے کچھ اُس کو مل جائے گا۔

دوسری حدیث میں جناب رسالتمآبؐ کی زبانی نقل فرماتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا: **ان اصنافا من امتي لايستجاب دعاؤهم** میری امت میں چند قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے ''**ورجل يقعد في بيته ويقول يارب ارزقني ولايخرج ولايطلب الرزق فيقول الله عزوجل عبدي الم اجعل لک السبيل الى الطلب والتصرف فيالأرض والجوارح صحيحة فتكون قد اعذرت فيما بيني وبيتک في الطلب لابتاع امري ولكيلا تكون كلا على اهلک**'' ایک وہ شخص ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔ اور کہے خداوند! مجھے روزی عطا کر لیکن گھر سے نکلے نہ اور روزی کی تلاش نہ کرے تو خداوند عالم (عالم معنی میں) اُس سے خطاب فرماتا ہے کہ اے میرے بندے! کیا میں نے تجھ کو تحصیل معاش کی قوت اور اطراف زمین میں نقل وحرکت کی طاقت اور اعضاء وجوارح عطا نہیں کئے، اس لئے کہ تو اپنے اعضاء وجوارح کو عمل میں لا کر میرے اور اپنے درمیان میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جا اور اپنے اعزہ واقارب کے لئے باردوش نہ بن''۔

تیسری حدیث ارشاد ہوتا ہے **إني لابغض الرجل فاعزافاه إلى ربه فيقول ارزقني ويترک الطلب** ''مجھ کو عداوت ہے ایسے شخص سے جو آسمان کے رخ پر منھ کھولے بیٹھا رہے 'خداوند مجھ کو روزی عطا کر' لیکن خود کوئی جدوجہد نہ کرے''۔

چوتھی حدیث امیر المومنین نے آیۂ مبارکہ **انه هو اغنی واقنی** ''خدا ہی وہ ہے جو لوگوں کو غنی بناتا ہے اور ان کے دلوں کو

خوشنود کرتا ہے''۔ اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے اغنی کل انسان بمعیشتہ و ارضاہ بکسب یدہ خدا غنی بناتا ہے ہر انسان کو لیکن اس کے ذاتی کسب معاش سے، اور وہ اس کے دل کو خوشنود کرتا ہے مگر اُسی کے دست و بازو کی محنت سے''۔

پانچویں حدیث امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں **یعجز احد کما ان یکون مثل النملة فإن النملة تجر الیٰ حجرھا** ''کیا تم چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو چونکہ چونٹی بھی اپنے سوراخ میں خود غذا کھینچ کر لے جاتی ہے'' کیا اس سے بڑھ کر صاف لفظوں کی ضرورت ہے؟۔

مطلب یہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی چیز چیونٹی اُس کے بھی خدا نے اس طرح رزق کی ذمہ داری نہیں لی ہے کہ وہ اُس کو گھر بیٹھے رزق عطا کرے، بلکہ خود چیونٹی نکلتی ہے خود اپنے کمزور پیروں سے رزق کی تلاش کرتی ہے اور اپنے مختصر دہن سے اپنے مقدار کفاف کو کھینچ کر اپنے مسکن میں لے جاتی ہے تو پھر تم کیا چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو کہ تم اس بات کے متوقع رہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تم کو گھر بیٹھے رزق عطا کیا جائے۔

چھٹی حدیث امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں اصحاب کا مجمع تھا کہ علاء بن کامل حاضر خدمت ہوئے اور حضرت کے سامنے بیٹھ گئے۔عرض کیا: **ادع اللہ ان یرزقني في طلب دعتہ** ''خدا سے دعا فرمایئے کہ مجھ کو راحت وآرام کے ساتھ رزق عطا فرمائے۔'' بیشک بہت کامیاب نسخہ تجویز کیا تھا۔ امام کی دعا اور پھر اگر وہ ہو جاتی تو کیا ممکن تھا قبول نہ ہوتی۔لیکن امامؑ نے جواب دیا: **لا ادعو لک اطلب کما امرک اللہ عزوجل** ''میں دعا نہیں کروں گا جاؤ اور جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے خود طلب معاش کرو۔''

اسی طرح کی ایک روایت کلیب صیداوی کی ہے: **قلت لابی عبداللہ ادع اللہ لي في الرزق فقد التاثت علی اموري** ''میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ ذرا خدا سے میرے لئے رزق کے بارے میں دعا کر دیجئے، اس لئے کہ میں آج کل بڑے مشکلات میں مبتلا ہوں۔'' حضرت نے فرمایا **لا اخرج فاطلب** ''نہیں گھر سے نکلو اور طلب معاش کرو''۔

امامؑ نے دعا نہ کی، اس لئے کہ قوت عمل سلب نہ ہو اور ذاتی محنت وکاوش سے دست کشی کر کے آرام طلبی کی عادت نہ پڑے۔ امامؑ موجود تھے اور اُن سے دُعا کی خواہش آسان اور دعا کر دینا بھی معمولی امر تھا۔لیکن امامؑ نے دعا سے انکار کر کے ہمیشہ کے لئے ایک عظیم سبق دے دیا۔ کہاں ہیں زیارت مشاہد مقدسہ سے مشرف ہونے والے اور ضریح مطہر کے سامنے قبۂ مبارک کے نیچے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر وسعت رزق اور خوشحالی وکشائش کی دعا مانگنے والے دعا مانگنا آسان ہے۔لیکن اُن کو کیا معلوم کہ ضریح مبارک سے عالم معنی میں یہی آواز نہ آجاتی ہوگی کہ نہیں، ہم تمہارے لئے دعا نہ مانگیں گے، جاؤ اور محنت مزدوری کر کے خود اپنی روزی حاصل کرو، بیشک جب انسان نے اپنی طاقت کو صرف کر دیا، اور اپنے مقدور بھر سعی وکوشش کی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ پھر خداوند عالم کا کام ہے کہ وہ اُس کو کامیابی عطا کرے۔کبھی وہ ایک کمزور دست و پا کی کمزور کوشش میں ایسی برکت عطا فرماتا ہے کہ بڑے بڑے طاقتور وتوانا اشخاص کی جہد وجہد میں حاصل نہیں ہوتی۔اسی سے ایک تیسرے خیال کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جس کو اکثر افراد اپنی بیکاری اور کسب معیشت میں کوتاہی کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ تجارت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے اور ہمارے پاس سرمایہ ہی نہیں تو تجارت کیوں کر کریں؟۔

حضور والا! تجارت کسی بڑی ایجنسی، بڑے کارخانہ، بڑے ادارے ہی کے قائم کرنے کا نام نہیں ہے۔کسب معیشت اور تجارت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ وہ زیادہ یا کم سرمایہ پر موقوف نہیں ہے، وہ ہزاروں لاکھوں روپیہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے اور دو چار پیسوں سے بھی۔جس طرح لاکھوں روپیہ کی تجارت شروع کرنے کے بعد انسان اپنے فرض سے ادا ہو جاتا ہے لیکن اُس کی ترقی، نشوونما اور سودمندی کسی دوسری بالا دست ہستی کی جانب

سے ہے، اسی طرح چند پیسوں کی تجارت شروع کر کے بھی انسان اپنے فرض سے ادا ہوتا ہے اور اُس میں خیروبرکت عطا کرنا دوسرے کا کام ہے۔ پھر اگر انسان کے پاس بہت زیادہ سرمایہ نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ اُس سے ممکن ہے اُس سے بھی فائدہ حاصل نہ کرے۔

یہ سبق ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال سے بہت واضح طور پر حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو عبد الرحمن بن حجاج کی روایت۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے مدینہ میں ایک شخص تھا، وہ سخت تنگدستی میں مبتلا اور فقر و فاقہ میں گرفتار ہوا، امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: **اذهب فخذ حانوتا في السوق والبسط بساطا فليكن عندك جرة ماء والزم باب حانوتك ثم ذكر انه فعل ذلك وصبر فرزقه الله وكثر ماله واثرى**۔

جاؤ اور بازار میں ایک جگہ مقرر کر کے فرش بچھاؤ اور بس اپنے پاس ایک صراحی پانی کی رکھ لو لیکن کسی وقت دوکان پر سے ہٹو نہ، یعنی پابندی کے ساتھ دوکان پر بیٹھو' راوی کا بیان ہے کہ اس شخص نے امام کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور خداوند عالم نے اسی ذریعہ سے اُس کو رزق عطا کیا اور کچھ دن میں اُس کی ثروت میں اضافہ ہوا اور وہ مالدار ہو گیا۔ بس اب حیلہ و بہانہ کے سلسلہ میں کوئی کڑی باقی نہیں رہی اور طلب معیشت میں کسی قسم کا عذر قابلِ سماعت نہیں رہا، سرمایہ کی کمی کا عذر بالکل ناقابل سماعت قرار پا گیا ہے، اس لئے کہ انسان کے پاس کچھ روپیہ نہ ہو لیکن پانی تو ممکن ہے۔ انسان اُسی پانی کو لے کر لب راہ بیٹھ سکتا ہے۔ آنے جانے والوں میں پیاسوں کی کمی نہیں ہوتی ہے اور انہیں ایک پیسہ دے کر ایک کٹورا پانی پی لینے میں کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔

یہ درحقیقت مثال ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان پانی ہی سے تجارت شروع کرے، مقصد یہ ہے کہ کم سے کم چیز جو انسان سے ممکن ہے اُسی کا روزگار شروع کرے اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر کے فرض کو انجام دے۔

اس قسم کے احادیث متعدد موجود ہیں، سید کی روایت ہے میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: "**أيّ شيءٍ على الرجل في طلب الرزق**" طلب معاش کے سلسلہ میں انسان کا فرض کیا ہے؟ **فقال اذا فتحت بابک وبسطت بساطلک فقد قضيت ماعليک**" حضرت نے فرمایا جب تم نے دروازہ کھول دیا اور زمین پر فرش بچھا کے کچھ لیکر بیٹھ گئے تو بس تم نے اپنے فرض کو پورا کر دیا۔"

طیار کا بیان ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے دریافت فرمایا: **أي شئ تعالج أي شی تصنع** تمہارا کیا روزگار ہے کون سا کاروبار کرتے ہو؟ "**قلت ما انا في شئ**" "میں نے عرض کیا کہ میں تو بالکل بیکار ہوں، کوئی روزگار نہیں ہے۔"

حضرت نے فرمایا **فخذ بيتا وكنس فناه ورشه وابسط فيه بساطا فاذا فعلت فقد قضيت ماعليک** ایک جگہ مقرر کرو اور اُس کو صاف کر کے پانی چھڑک کر اُس میں فرش بچھاؤ اور بیٹھ جاؤ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا فرض ادا کر دیا، راوی کہتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا اور میرے کاروبار میں ترقی ہوئی اور مجھ کو رزق عطا ہوا۔

ابوعمارہ طیار کی روایت "**قلت لأبي عبد الله انه قد ذهب مالي وتفرّق ما في يدي وعيالي كثير**" میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میرا مال سب جاتا رہا اور جو کچھ تھا وہ متفرق ہو گیا اور میرے متعلقین بہت ہیں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ حضرت نے فرمایا "**اذا قدمت فافتح باب حانوانک وابسط بساطک وصنع ميزانک وتعرض لرزق ربک**" اپنی دوکان کا دروازہ کھولو اور فرش بچھاؤ اور ترازو لے کر بیٹھ جاؤ اور اس طرح خداوند عالم کے رزق کا اپنے کو مستحق ثابت کرو۔

پھر اگر کچھ بھی انسان کے پاس نہ ہو کہ وہ اُس سے تجارت کر سکے اور اُس کو فروخت کرے تو انسان کے ذاتی اعضاء و جوارح دست و بازو کی قوت وہ تو کسی سرمایہ کی محتاج نہیں ہے۔ انسان اُسی کے ذریعہ سے طلب معاش کر سکتا ہے۔ چنانچہ زرارہ کی

روایت ہے ”ان رجلا اتی ابا عبد اللہ فقال إني لا احسن ان اعمل عملا بيدي ولااحسن اتجراني محارف محتاج“ ایک شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی کام نہیں آتا اور تجارت کا بھی سلیقہ نہیں بالکل فقیر و محتاج اور عاجز ہوں پھر اب کیا کروں؟ امام نے عرض کیا: اعمل فاحمل علی راستک و استغن عن الناس فإن رسول اللہؐ قد حمل حجرا علی عنقه فوضعه في حائط من حيطانه“ بیکار نہ رہو کچھ نہیں تو اپنے سر پر اسباب ڈھو کر مزدوری کرو اور اس طرح لوگوں سے استغناء حاصل کرو اور یہ کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ رسالتمآبؐ اپنی گردن پر پتھر اُٹھا کر لے گئے ہیں اور باغ میں رکھا ہے۔ اس سے چوتھے خیال کا دفعیہ بھی ہوگیا، جو اکثر ذہنیتوں میں پایا جاتا ہے کہ تجارت جب تک کسی اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہو وہ انسان کی حقارت کا باعث ہے اور یہ کہ مزدوری و پیشہ وری انسان کی ذلت کا سبب ہے۔ درحقیقت یہ افسوسناک خیال وہ ہے جو عام طور پر ہماری قوم کے افراد کے لئے تجارت و پیشہ وری میں سدراہ ہوگیا ہے۔ ہماری قوم میں پیشہ ور ذلیل نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور مزدوری کرنے والا پست درجہ کا شخص سمجھا جاتا ہے۔ جب تک یہ خیال راسخ ہے اور سفید پوش طبقہ ان چیزوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس وقت تک کسی قسم کی کامیابی ہونا مشکل ہے کیونکہ اس افلاس و پریشان حالی کے عالم میں جو عام وبا کی صورت سے افراد قوم میں پھیلی ہوئی ہے یہ توقع تو کی نہیں جاسکتی کہ ہر شخص کوئی بڑا کارخانہ یا ایجنسی یا کمپنی قائم کرسکتا ہے جو باعزت نظر سے دیکھا جائے، ابھی تو جو صورت ممکن ہے وہ یہی کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق معمولی سرمایہ سے ایک کام کو شروع کرے پھر جب وہ سمجھتا ہے کہ جس دن میں نے ایسا کیا اس دن سے میری جو بھی موجودہ عزت ہے وہ خاک میں مل جائے گی، جو لوگ آج سلام کرتے ہیں وہ منہ دے کر بات نہ کریں گے تو بھلا وہ کاہے کو قدم آگے بڑھانے لگا؟ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ نکبت و افلاس میں زیادتی ہوتی جائے اور قوم کا مرض ترقی کرتے کرتے ایک دن اُس کو گوشہ قبر میں پہنچادے۔

یہی ذہنیت وہ تھی جس کے بدلنے کے لئے آئمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے طرز عمل کے نمونے دکھلائے۔ حضرت رسولؐ کی سیرت سے نظیریں پیش کیں اس لئے کہ دنیا میں کوئی کتنی ہی عزت حاصل کرے لیکن اگر وہ مسلمان ہے تو اپنے رسولؐ کی عزت کے مقابلہ کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ عالم امکان کی یہی عظیم ہستی جس کی عزت کے مقابلہ میں دنیا کی عزتیں خاک سیاہ ہیں، ہم کو مزدوری کرتے نظر آرہی ہے تو اب دنیا میں کون ہوسکتا ہے جو اپنی عزت کے گھمنڈ پر مزدوری کو اپنے لئے عار وننگ سمجھے۔

اگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بلند آواز سے اعلان کررہے ہیں کہ پیشہ ور افراد کو ذلیل نظر سے نہ دیکھو، صنعت وحرفت، تجارت، مزدوری کو حقارت کا باعث نہ سمجھو۔ وہ لوگ جو پیشہ ور لوگوں کو ذلیل نظر سے دیکھتے ہیں اگر غور کریں تو حقیقتاً انبیاءؑ کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں، اس لئے کہ وہ سب محنت مزدوری کرتے تھے۔ اگر اُن کی عظمت کا دل پر اثر اور اُن کی عزت کا لحاظ ہے۔ تو پیشہ وری ذلیل نظر سے دیکھے جانے کی مستحق نہیں ہے۔

سابقہ بیانات کے متعلق پیداشدہ سوالات کا حل

قناعت اور اس کا مفہوم- مذکورہ حقائق کے مقابلہ میں جو سوالات پیش ہوئے ہیں اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ قناعت کیا چیز ہے اور وہ کہاں تک کسب معاش کے سلسلہ میں انسان کے لئے ضروری ہے اور کیا طلب معاش میں سعی وکوشش قناعت کے خلاف نہیں ہے؟

قناعت کے مفہوم پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے، اس کے دو شعبے ہیں، ایک قناعت فی الطلب اور دوسرے قناعت فی المصرف، کیونکہ انسان کی زندگی بھی بہ اعتبار اموال دنیا کے ان ہی دو دوروں میں منقسم ہے: ایک دور اموال کے جمع کرنے کا اور دوسرا دور صرف کرنے کا اور ان دونوں شعبوں میں قناعت کا

عنصر کارفرما ہے۔ پہلا یعنی قناعت فی الطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ اُس ذاتی محنت ومشقت، کدوکاوش سے اُس کو دستیاب ہو اور گاڑھی کمائی کا جو کچھ روپیہ اُس کو ملے کم یا زیادہ اُسی پر راضی وخوشنود ہو کر شکر خدا ادا کرے اور دوسروں کے اموال کو للچائی نظروں سے نہ دیکھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ آجائیں مثلاً انسان نے دوکان لگائی اور دن بھر دوکان میں بیٹھا جو کچھ خدا کو منظور تھا اُتنی آمدنی اُس کو حاصل ہوئی۔ مزدور صبح سویرے مزدوری کرنے باہر نکلا اور اپنی ذاتی مشقت وزحمت سے دن بھر کام کیا اور جتنا منظور الٰہی تھا اُتنا اُس کے ہاتھ آیا، صناع صنعت وحرفت کے آلات لے کے بازار گیا اور جتنے کی مزدوری لگنا تھی اتنے کی لگی اور گھر واپس ہوا۔ تو یہی آمدنی جو اُس کو اپنی محنت مزدوری سے حاصل ہوئی ہے، اُسی کو وہ اپنے لئے سلطنت ہفت اقلیم کے برابر سمجھے بیشک اُس کو حق ہے کہ دوسرے دن اگر اُس کے لئے وسیع ذرائع مہیا ہوں تو اُن ذرائع کو عمل میں لائے اور کوشش کرے، لیکن نتیجہ کو اُس کے پھر بھی خدا کے سپرد کرتے ہوئے صبر وسکون کے ساتھ اُس کے استقبال پر تیار ہو۔

یہ نہیں کہ جو کچھ اپنے ہاتھ آیا وہ آیا، لیکن نیت نہیں بھرتی دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں اُن کی طرف بھی حرص وآز کی نظریں پڑ رہی ہیں اور یہ فکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُن پر قبضہ ہو اُس کے لئے اگر ضرورت پڑی تو دست سوال اور موقع ہوا تو دست تعدی دراز کیا اور اُس کو حاصل کیا، یہ ہے وہ طمع وحرص جو انسانی جذبات میں سیلاب کا حکم رکھتی ہے۔ اور وہ پیدا ہونے کے بعد کسی حد محدود تک ٹھہرنا نہیں جانتی اس لئے کہ خدا کی نعمت لامحدود اور انسانی افراد کا تفرقہ اُس میں لاانتہا ہے۔ انسان اگر جذبۂ حرص رکھتا ہے تو وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وہ جتنی بھی کوشش کرے خدا کی تمام خدائی اس کے قبضہ میں نہ آئے گی، لہٰذا وہ جتنا بھی مالدار اور صاحب ثروت واقتدار ہو جائے ہمیشہ بھوکا ہے اس لئے کہ اُس کی نیت سیر نہیں ہوئی، برخلاف اُس شخص کے جو جوہر قناعت کو اپنے پاس لئے ہوئے ہے۔ وہ جدوجہد کرتا ہے اور کوشش وکاوش کی جائز حدود کو ختم کرتا ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ اُس کو مل جاتا ہے۔ اس کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتا ہے اور اُس کی سیرچشمی اُس کو آگے نظر اٹھا کر دیکھنے کی دعوت نہیں دیتی اور اب اگر شوکت شاہانہ بھی سامنے ہو اور دولت قارون بھی پیش پا ہو تو وہ اسے اپنے لئے ننگ سمجھتا ہے۔ یہی چیز وہ ہے جس کے متعلق امیر المومنین نے 'نہج البلاغۃ' میں ارشاد فرمایا ہے: "**من اراد الغنی بغیر مال فعلیه بالقناعة**" جو بغیر مال ودولت کے غنی وتونگر بننا چاہتا ہے وہ قناعت اختیار کرے۔

اس قناعت کی مختصر تعبیر یہ ہے کہ **هو الکف عما في ایدي الناس** وہ دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں اُن سے ہاتھ روکے رہنے کا نام ہے۔ اس طرح بھی کہ دست سوال دراز نہ کرے جو دناءت طبع اور پست فطرتی کا نتیجہ ہے اور اس طرح بھی کہ دستِ تعدی دراز نہ کرے جو شقاوت وقساوت، حق کشی اور ناحق کوشی کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی کی دوسری لفظیں یہ ہیں کہ "**هو الرضا بالقسم**" وہ اپنی قسمت کے حصّہ اور نصیب پر رضامندی کا نام ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے ذاتی ذرائع و اسباب اور محنت ومشقت کو بھی صرف نہ کرے اس لئے کہ اس صورت میں تو جو قسمت کا حصّہ اور نصیب تھا، اُس کے ملنے کی بھی اس کو توقع نہیں، کیونکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ ذاتی محنت ومشقت اور اسباب وذرایع کے مہیا کرنے کے ساتھ مشروط ہے اور اس بناء پر درحقیقت اپنے طاقت ومقدور کے مطابق اسباب و ذرائع صرف کرنے سے پہلے قناعت کا محل استعمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابھی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ مقسوم الٰہی اس کی نسبت کیا ہے، اصل قناعت کا محل استعمال اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب اسباب وذرائع ذاتی کے صرف کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچ جائے۔ بیشک اب قناعت کا موقع ہے، اور اس وقت قناعت نسب واصلح اور انسان کی شان خودداری وبلند ہمتی کے لئے موزوں وشایان بھی ہے۔

دوسری چیز قناعت فی المصرف ہے۔ اس کے معنی روزمرہ

کی اردو زبان میں یہ سمجھنا چاہئے کہ جتنی چادر ہو اتنا پیر پھیلائے یعنی انسان اپنی آمدنی اور ضروریات زندگی میں توازن کو قائم رکھے۔ جتنی انسان کی بساط ہو، اُتنا ہی صرف بھی کرے۔ اور اُس سے زیادہ کا طالب نہ ہو یہ قناعت وہ ہے جس کی حضرت سلمانؓ نے تعلیم دی تھی جب اُنہوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی دعوت کی اور سوکھی روٹی سامنے پیش کی۔ جناب ابوذرؓ کی زبان سے کہیں نکل گیا کہ اس کے ساتھ نمک بھی ہوتا تو بہت اچھا تھا یہ سُن کر حضرت سلمانؓ فرائض میزبانی کی نگہداشت اور مہمان کی خاطرداری کے لئے گئے۔ اپنا آفتابہ رہن کیا اور نمک خرید کر لائے غذا کے تناول کے بعد حضرت ابوذرؓ نے کہا: **الحمد للہ الذي جعلنا من القانعین** شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو قناعت گذار قرار دیا۔ یہ سنا تھا کہ حضرت سلمانؓ نے منھ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ یہ نہ کہو اگر قناعت گذار ہی ہوتے تو اس آفتابہ کے رہن کی نوبت نہ آتی۔ ظاہری صورت سے واقعہ بالکل معمولی ہے اور نمک کا معاملہ ہے لیکن درحقیقت اس کے ضمن میں ایک عظیم تعلیم مضمر ہے اور وہ یہی، کہ انسان کو بس جتنا موجود ہے اس میں اپنے ضروریات کو محدود رکھنا چاہئے اور نمک کی بھی ضرورت ہو تو اُس کو قرض و رعاریت، رہن وغیرہ عارضی ذرائع سے حاصل نہ کرے۔

حقیقتاً یہ قناعت وہ ہے۔ جس کا نہ ہونا مسلمانوں کا ایک مستقل اور بہت بڑا مرض ہے۔ جس کے لئے خاص طور سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور جس نے مسلمانوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب کیا ہے۔

ایک مسلمان کبھی اپنی آمدنی وخرچ کا توازن نہیں قائم رکھتا۔ حیثیت معمولی اور مصارف امیرانہ، اچھے سے اچھا لباس، اچھے سے اچھی غذا اور اگر کہیں کوئی تقریب ہوگئی جیسے شادی، زچہ خانہ، بچہ کا عقیقہ یا ختنہ وغیرہ تو پھر تو روپیہ کے وارے نیارے۔ وہ اولوالعزمی کہ **العظمۃ للہ** حیثیت دس روپیہ ماہوار کی بھی نہیں لیکن شادی میں ہزاروں روپیہ بیکار کے رسوم میں صرف کردیئے، پھر آئیں کہاں سے؟ سودی روپیہ لے کر، مکان زمین رہن کر کے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ آج شادی ہوئی خانہ آبادی لیکن کل وہ شادی ناشادی اور آبادی بربادی بن گئی سود بڑھتے بڑھتے اصل کے برابر یا اُس سے بھی دونا چوگنا ہوگیا، مہاجن نے دعویٰ کیا اور جو کچھ مال منقولہ غیر منقولہ تھا سب اُس کی نذر ہوا اور بعض اوقات نتیجہ وارنٹ اور گرفتاری تک پہنچا۔ یہ سب نتیجہ کاہے کا ہے؟ آمدنی وخرچ میں توازن نہ رکھنے اور اپنی حیثیت کو خیال نہ کرنے اور اُس قناعت پر عمل نہ رکھنے کا جس کو انسان کے لئے ہر وقت اپنا نصب العین رکھنا ضروری ہے۔

یہ قناعت کے معنی ہیں نہ یہ کہ انسان ذرائع کسب معاش کو چھوڑ بیٹھے اور کسب حلال نہ کرے بلکہ عجز و درماندہ فقر و فاقہ کی حالت میں ساکت وخاموش بیٹھا رہے۔

الدنیا زور لایحصل الابالزور: اس حدیث شریف کے متعلق یہ سوال ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا صرف مکر وفریب ہے اور مکر وفریب حاصل نہیں ہوسکتی لہٰذا طلب دنیا کہ جس پر سابقہ بیانات میں زور دیا گیا ہے وہ جائز کیوں کر ہوسکتی ہے؟۔

لیکن حقیقۃً یہ سوال ہمارے سابقہ بیانات پر غور کرنے میں فروگذاشت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے طلب دنیا کے روشن اور تاریک دونوں ہی پہلو پیش کئے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی حکم جو کسی شے کے متعلق بتلایا جائے وہ اُس شے سے متضاد نہیں ہوسکتا۔ مثلاً یہ کہنا کہ بیمار صحیح ہے، سفید سیاہ ہے، متحرک ساکن ہے۔ خاموش گویا ہے۔ خشک تر ہے۔ گرم سرد ہے، وغیرہ وغیرہ غلط ہوگا اس لئے کہ جب بیمار کو بیمار مان لیا تو اس کو صحیح کہنے کے کوئی معنی نہیں، سفید کو سفید کہہ دیا تو سیاہ نہیں اور وہ شے کہ جو متحرک ہے، ساکن نہیں اور خاموش گویا نہیں۔ اور خشک تر، گرم سرد نہیں ہوسکتا کیوں کہ متضادات اوصاف ہیں جو قابل اجتماع نہیں ہیں۔

طلب دنیا جس کو میں نے اسلامی تعلیم کا جزو بتلایا ہے وہ

طلب حلال ہے اور کسب جائز کا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مکر و فریب عام مواقع کے اوپر حلال اور جائز نہیں بلکہ ناجائز وحرام ہی ہے۔ تو اب اگر متذکرۂ بالا حدیث میں دنیا سے مراد یہی طلب حلال وکسب جائز ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ طلب حلال حرام ہے اور بغیر ذرائع حرام کے حاصل نہیں ہوسکتا یہ جملہ ویسا ہی ہے جیسے سفید سیاہ اور خشک تر ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا بہ مناسبت حکم یہ یقین ہے کہ دنیا سے مراد وہی دنیا ہے جس کی انتہائی تاریک تصویر میں سابق میں پیش کر چکا ہوں۔ اس سے صرف یہی حدیث نہیں بلکہ کتب احادیث واخلاق اُن سے چھلک رہے ہیں، اُن سب کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو ذرائع حلال کے واسطہ سے طلب معیشت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

الدنیا سجن المؤمن و جنة الکافر: اس حدیث سے بھی یہ توھم پیدا ہوتا ہے کہ جب معصوم کا ارشاد ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے بہشت ہے تو اب جو شخص ایمان کے درجہ پر فائز ہو اس کو تو اس دنیا میں کسی راحت وآرام کی توقع ہی نہ کرنا چاہیے اور اُسی زندگی کے لئے تیار رہے جو قیدیوں کے لئے ہوا کرتی ہے، لہٰذا طلب معیشت وکسب دنیا میں کوشش سب بیکار ہے، یہ وہ خیال ہے جو حدیث کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتا ہے لیکن امام علیہ السلام نے حدیث کے صحیح معنی بیان فرما کر اس خیال کو بالکل غلط کر دیا ہے۔ وہ موقع جب امام رضاؑ حشم وخدم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر فرما رہے تھے۔ اور راستہ میں ایک یہودی فقر وفاقہ کی مصیبت میں گرفتار، مرض میں مبتلا، گلی میں پڑا ہوا تھا۔ اُس یہودی نے امام کو اس شان وشوکت سے دیکھ کر حضرت کو اپنے قریب بلایا اور کہا کہ دیکھئے! میں اس وقت آپ کے نانا کے قول کو غلط ثابت کرتا ہوں۔ ان کا قول ہے ''**الدنیا سجن المؤمن و جنة الکافر**'' اور یہ ظاہر ہے کہ آپ بموجب عقیدۂ اسلام مومن اور میں کافر ہوں۔ لیکن آپ اس وقت بہتر سے بہتر حال میں اور میں بد سے بدتر حالت میں ہوں۔ امامؑ نے فرمایا کہ تم قول رسولؐ کا مطلب صحیح نہیں سمجھے۔ بیشک دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے بہشت، مگر اُس کے معنی یہ ہیں کہ مومن کے لئے آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ وہ ان کے مقابل میں اگر دنیا کو دیکھے تو وہ اپنی تمام زیب وزینت سمیت قید خانہ معلوم ہوگی اور کافر کے لئے آخرت میں وہ سخت ترین عذاب ہیں کہ وہ اُن کے مقابل میں دنیا کو دیکھے تو وہ اپنے تمام تکالیف ومصائب سمیت بہشت معلوم ہوگی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن کے لئے راحت وآرام اور کافر کے لئے مصیبت وتکلیف کا ہونا اس دنیا میں بالکل ناممکن اور غیر قابل وقوع ہے۔

کسب معیشت کا وسیع مفہوم: سابقہ بیانات سے میرا جو کچھ بھی مقصد ہے اور اسلامی تعلیمات سے جو کچھ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہئے بلکہ اپنی ذاتی محنت و مشقت سے اپنی بسر زندگی کا سامان کرے اور اپنے اہل وعیال کا آزوقہ مہیا کرے اور اگر قوت وطاقت وفا کرے تو اس سے زیادہ حاصل کر کے بندگان خدا کو فائدہ پہنچائے، قومی ومذہبی کاموں میں صرف کرے اور اس طرح دنیا کو تمہید آخرت بنا کر دنیا وآخرت دونوں کا مالک ہو۔ یہی ہے کسب معیشت اور طلب حلال کا مفہوم، اس کے وسائل وذرائع کسی خاص صورت میں محدود نہیں ہیں اور نہ اس کے لئے یہی ضرورت ہے کہ انسان دکان رکھے اور کسی چیز کی خرید وفرخت ہی کرے جس کی وجہ سے ایک طرف یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ آج کل تجارت میں فائدہ مفقود ہوگیا۔ جو لوگ اس شعبہ میں عمریں گذار چکے ہیں وہ بھی اب ان مشکلات سے عاجز وحیران نظر آرہے ہیں جو اُن کو پیش آتی ہے اور عام طور سے کساد بازاری نے اُن کو فنا کے درجہ تک پہنچا دیا ہے دوسری طرف اکثر وہ افراد جو درحقیقت کسب معیشت کے طریقہ پر عملی طور سے قائم ہیں، وہ بھی کسب معیشت کے معنی دکان رکھنے میں ہی محدود سمجھ کر اپنے طرز عمل کی تبدیلی پر غور کر رہے ہیں۔ اس لئے اس امر کا واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا

ہے کہ کسب معاش کا مفہوم اتنا محدود نہیں ہے۔ جیسا کہ خیال کیا جارہا ہے۔ کسب معاش کا مفہوم وسیع ہے۔

اپنی ذاتی محنت ومشقت کے معاوضہ میں سامان زندگی فراہم کرنا، اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایک صناع جو اپنی صنعت وحرفت سے روپیہ کماتا ہے۔ ایک معمار، نجار، بیلدار مزدور جو دن بھر کام کرتا ہے اور اُجرت لیتا ہے۔ ایک انشا پرداز جو اپنے قلمی خدمات کے ذریعہ سے زندگی گذارتا ہے ایک مدرس جو جائز علوم کی تعلیم کے سلسلہ میں کسی کالج اسکول مدرسہ سے تعلق رکھتا ہے، ایک طبیب جو حدود شرع کے اندر طبابت کی فیس لے کر بسر اوقات کرتا ہے، یہ سب ہی کسب معاش اور طلب حلال کے فریضہ پر عمل درآمد کرنے والے ہیں۔ اور اُن کا طرز عمل کی حیثیت سے قابل اعتراض نہیں ہے۔

تقسیم عمل کی بنا پر طریق کار میں اختلاف: یقیناً تقسیم کے اصول پر نظام اجتماعی کے لئے یہ صورت ممکن نہیں ہے کہ سب ہی افراد دکان رکھ لیں اور تجارت شروع کردیں اس لئے کہ اس صورت میں اہم قومی ومذہبی واجتماعی کاروبار بند ہوجائیں گے اور نظام اجتماعی درست نہ ہوگا، لہٰذا ہر شخص کو اپنے فرائض وحیثیات پر نظر کرتے ہوئے خود اپنے مناسب حال طریق کار کے تجویز کرنے کا حق ہے جس کے بعد اس سوال کا موقع نہیں ہے کہ تم تجارت ہی کیوں نہیں کرتے؟ یقیناً جس طرح قوم میں ضرورت ہے کہ ایک طبقہ تجار کا ہو، اسی طرح ضرورت ہے کہ مثلاً ایک طبقہ اطباء کا ہو، ایک طبقہ اہل صنعت وحرفت ودستکاری کا ہو، ایک طبقہ واعظین کا ہو ایک طبقہ علماء کا ہو وغیرہ وغیرہ تاکہ نظام نوعی کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ بیشک ان میں سے ہر طبقہ کو جہاں تک موقع ہو اپنے مناسب حال کسب معیشت کے طریقہ کو اختیار کرنا چاہئے لیکن ضروری نہیں کہ وہ تجارت یا دوکانداری ہی ہو۔ جناب رسالتمآبؐ نے قبل بعثت اموال خدیجہؑ کی تجارت فرمائی، بعد بعثت تبلیغی ضرورتیں اور نبوت ورسالت کے فرائض اتنے اہم تھے کہ اگر قائم ودائم طریقہ سے وہی سلسلہ قائم رہتا تو حضرت کے لئے اِن فرائض کا پورا کرنا ناممکن تھا لہٰذا حضرتؐ کی سیرت میں اس کے بعد سے مستمر طریقہ سے تجارت پر عمل درآمد نظر نہیں آتا اور اسی طرح ائمہ معصومینؑ کی سیرت میں بھی ایسا نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنی عمر ہی تجارت میں گذاری ہو اور دوکان پر بیٹھے ہوئے زندگی ختم کی ہو۔ اس لئے کہ اُن کے فرائض اس سے مانع تھے۔ پس اتنا ہے کہ انہوں نے یہ دکھلانے کے لئے کہ تجارت عار وننگ نہیں ہے اور تعلیم دینے کی غرض سے کبھی کبھی یہ صورتیں بھی اختیار کرکے دکھادیں۔ چنانچہ رسالت مآبؐ کے متعلق ایک دفعہ کا تذکرہ جو نبوت کے بعد کا ہے سابقاً ہوچکا ہے، جس کو امام جعفر صادقؑ نے اپنی حدیث میں ذکر فرمایا ہے کہ ان رسول اللّٰہ اشتری عیرا اتت من الشام فاستفضل فیھا ما قضیٰ دینہ وقسم في قرابتہ ''رسالتمآبؐ نے شام سے ایک تجار کا قافلہ آیا تھا اس کے مال کو خرید فرما کر تجارت کی اور جو نفع حاصل ہوا اُس سے اپنے قروض ادا کیے اور اپنے اعزا کی خبرگیری کی، اور یہی صورت ائمہ معصومین علیہم السلام کی ہے۔''

علماء ملت اگر تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ کو ننگ وعار سمجھیں اور حقارت وتوہین کی نظر سے دیکھیں تو بیشک قابل اعتراض اور تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف ہے لیکن اگر وہ تجارت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے خود اپنے فرائض کی بناء پر اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کریں اور دوسرے جائز ومستحسن ذرائع سے اپنے کسب معیشت کا سامان کریں تو اس اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے کہ علماء تجارت کیوں نہیں کرتے؟

علمائے ملت اور واعظین کا فرض: بیشک علماء وواعظین پر یہ فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہدایات وبیانات سے قوم کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور جو غلط خیالات راسخ ہوگئے ہیں اُن کی کمزوری کو واضح کریں اور اس ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اگر کسی اقدام عمل کی ضرورت ہو تو اُس سے بھی دریغ

بقیہ۔۔۔۔۔صفحہ ۳۱ پر

بتایا ہے کہ انسان کا اصلی حاکم اور مالک اور خالق ورازق صرف اللہ ہے اور اسی کے حکم پر چلنے میں اس کی نجات ہے۔

اقتصادی پہلو کے ساتھ ہی اس آیت میں انسان کے عملی شعبوں کے لئے کچھ بنیادی اصول بتائے گئے ہیں۔غرض انسانی اقدار کی حفاظت اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق اور ذمہ داریوں کا جس طرح اسلام نے سبق دیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

حیات انسانی کے ان دونوں پہلوؤں سے متعلق قرآن حکیم نے جو انتہائی مضبوط نظام ہمیں بتایا ہے وہ زمان ومکان کی حدبندیوں سے آگے اور آفاقی ہے اور قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ یہ عظیم نظام قرآن حکیم کی صورت میں ہمیں رمضان ہی کے مبارک مہینہ میں دیا گیا جس کا ہر دن برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے خصوصیت کے ساتھ اس کے آخری جمعہ یعنی جمعۃ الوداع کی فضیلت کی تو انتہا ہی نہیں ہے۔مبارک ہیں وہ اللہ کے مخلص بندے جو اس عظیم دن کی برکتوں سے محروم نہ رہیں۔

✿✿✿

بقیہ۔۔۔۔تجارت اور اسلام

نہ کریں اس لئے کہ یہ غلط خیالات وہ ہیں جو قوم کو تنزل کے اُس عمیق گڑھے میں لے جا رہے ہیں جس سے اُبھرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔

صورت عمل یا طریق علاج: اس کے لئے ضرورت ہے کہ قوم کے افراد کو اپنی کمزوری کا احساس ہو اور وہ اس کے تدارک کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ہماری قوم میں انجمن سازی کا شوق ہے مگر اتنا اہم کام اور وہ اب تک کسی انجمن کے خدمات سے محروم۔ضرورت ہے کہ ہر ہر محلہ میں انجمنیں قائم ہوں خطباء و واعظین سے قوم کی اقتصادی تباہی اور تجارت کی اہمیت پر تقریریں کرائی جائیں ایسے شخص کو جو دوکان رکھنا چاہے ہر قسم کی اخلاقی امداد پہنچائی جائے اور اس کی دوکان کو اپنی دوکان سمجھ کر اُس کے مفاد کی بہبودی پر نظر ہو۔ جو جذبہ قومیت کے تحت میں ہونا چاہئے۔اس لئے کہ اس جذبۂ قومیت کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ جو بیچارہ اس سلسلہ میں قدم بھی رکھتا ہے۔اُس کو دوسرے ہی دن ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے اس لئے کہ ادھر اس نے دوکان رکھی اور احباب و برادران کو خبر ہوئی، دوسرے ہی دن آداب عرض اور سلام علیکم، اپنے سابقہ تعلقات اور قدیمی دوستی و روابط کا پتہ دیتے ہوئے یہ سوال پیش ہوا کہ اتنا قرض دے دیجئے۔اس بیچارے کے مشکلات سے کوئی غرض نہیں کہ (ابھی اس کی) پونجی کم ہے۔ابتدائی منزل ہے کتنی دشواریاں پیش ہوں گی اور کیا مشکلات اُس کے سامنے ہوں گے؟ یہ کچھ نہیں، غرض تو اپنے مطلب سے ہے چاہے اُس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو۔اب اگر اُس نے مروت و دوستی سے مرعوب ہوکر خواہش کو پورا کردیا تو دوسرے صاحب تشریف لائے اور تیسرے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوکان دوستوں کی نذر ہوگئی اور نفع کے عوض نقصان اُٹھانا پڑا اور اگر کہیں اس بیچارے نے اپنے مشکلات پیش کرتے ہوئے عذر کیا۔تو بس پھر کیا تھا؟ آئینہ خاطر پر غبار آیا۔آ بگینوں کو ٹھیس لگی۔ اور کہا کہ جب اتنا بھی نہ ہوا تو اپنے ہم قوم سے فائدہ کیا؟ ہم غیروں کی دوکان سے خرید لیں گے۔اس دوکان سے اب نہ لیں گے۔

یہ نتیجہ ہے قومیت کے نہ ہونے کا اور شخصی مفاد پر قومی ہمدردی کو قربان کردینے کا۔انجام یہ ہوا کہ غیروں نے اُس دکان سے نہ خریدا اپنے احساس قومیت اور اس خیال سے کہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے پاس نہ جائیں اور اپنوں نے نہ خریدا اپنے عدم احساس قومیت سے، آخر دکان ٹوٹ گئی اور جو منظور تھا حاصل نہ ہوا۔اگر یہ لیل ونہار ہے اور یہی صورت حال، تو کامیابی معلوم اور ملت اسلام کو آخری سلام۔والسلام۔

(اشاعت اول، ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۵ء)

✿✿✿